بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۱ | ۱۰ مئی ۲۰۲۴ء مطابق یکم ذیقعدہ ۱۴۴۵ھ | شمارہ نمبر ۱۳

اس شمارے میں

شعروادب		
آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا	علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ	۴
اداریہ		
اے اللہ! میں حاضر ہوں	شمس الحق ندوی	۵
سراغِ زندگی		
عزم صادق اور اخلاص ہر کامیابی.....	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۷
نعمتِ ربانی		
حج ایک خاص لذت و کیفیت	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۱۲
فکر معاصر		
ابراہیمی سنت کو زندہ کرنے کی ضرورت	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۳
نشانِ راہ		
حالات کا نیا رخ اور علماء کی ذمہ داری	مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی	۱۶
راہِ عمل		
وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسانیت	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۲۰
تعلیم وتربیت		
مثالی استاذ کی خوبیاں	ڈاکٹر سراج الدین ندوی	۲۳
یادِ رفتگاں		
مولانا عبدالعلیم فاروقی رحمۃ اللہ علیہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۲۵
زبان وقلم		
ہندوستانی میڈیا میں اردو صحافت	ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی	۲۸
رودادِ چمن		
لیگل لیٹریسی کورس کا سالانہ پروگرام	منور سلطان ندوی	۳۱
فقہ وفتاویٰ		
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی

نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر: محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت: مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/400	فی شمارہ -/20	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ 75$

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلدی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

خودکُشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خود دار　　تم اخوّت سے گُریزاں، وہ اخوّت پہ نثار
تم ہو گُفتار سراپا، وہ سراپا کردار　　تم ترستے ہو کلی کو، وہ گُلستاں بہ کنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

مثلِ انجم اُفُقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے　　بُت ہندی کی محبت میں بَرہمن بھی ہوئے
شوقِ پرواز میں مہجورِ نشیمن بھی ہوئے　　بے عمل تھے ہی جواں، دِین سے بدظن بھی ہوئے
ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنَم خانے میں آباد کیا

عہدِ نَو برق ہے، آتش زنِ ہر خرمن ہے　　ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گُلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کُہن ایندھن ہے　　ملّتِ ختمِ رُسُلؐ شُعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گُلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی　　کوکبِ غُنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گُلستاں خالی　　گُل بر انداز ہے خُونِ شُہَدا کی لالی
رنگ گردُوں کا ذرا دیکھ تو عُنّابی ہے
یہ نِکلتے ہوئے سُورج کی اُفُق تابی ہے

اُمّتیں گُلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں　　اور محرومِ ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی ہیں　　سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں
نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

☆☆☆☆☆

اداریہ

اے اللہ! میں حاضر ہوں

شمس الحق ندوی

رمضان المبارک میں مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا حکم تھا، جس کا مقصد صرف بھوکا رہنا نہ تھا بلکہ اس سے ایک خاص روحانی تربیت مقصود تھی، کہ جس طرح بندۂ مومن نے زندگی کے سارے جھمیلوں کے ساتھ پورا ایک مہینہ نہ صرف یہ کہ حلال و پاکیزہ روزی سے سحری کے بعد سے افطار تک ہاتھ روکے رکھا بلکہ ہر طرح کی برائیوں اور گناہوں سے بچنے کی فکر کی، جھوٹ و فریب، غیبت و بدکلامی، ظلم و زیادتی، پرایا مال کھانے، غرض ہر اس بات سے بچا جو اس کے مالک و خالق کو ناپسند ہے، غریبوں اور محتاجوں کی ضرورت پوری کرنے میں حوصلہ مندی دکھائی، اس بابرکت مہینہ کے روحانی ماحول نے اس کے دل کو نورانی بنا دیا؛ لیکن بندہ بہرحال بندہ ہے، اور شیطان اس کو غلط راہ پر لگانے کے لیے ہمہ وقت چوکس رہتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی حفاظت و تربیت کو مختلف شکلوں میں جاری رکھتا ہے۔

رمضان گذر جاتا ہے، تو سال بھر کے بعد آتا ہے، اس میں جو مشق و تربیت ہوئی تھی، اگر اس کو مختلف طریقوں سے تازہ نہ کیا جاتا رہے تو اس کو جو روحانی و نورانی طاقت حاصل ہوئی تھی، زندگی کے جھمیلے جن میں شیطان ہر وقت ساتھ لگا رہتا ہے، اس روحانی و نورانی طاقت کو کمزور کرنے لگتا ہے، جس طرح وقت پر غذا نہ ملنے سے جسمانی طاقت کمزور ہوتی ہے، اسی طرح یہ نظام تربیت حج و قربانی کی صورت میں رمضان المبارک کے صرف سوا دو ماہ کے بعد آجاتا ہے، حج اگرچہ ہر مسلمان نہیں کرسکتا اور نہ ہی ہر ایک کو ہر سال اس کا مکلّف بنایا گیا ہے، لیکن اس سے عشق و سرمستی کی ایک فضا ضرور قائم ہوجاتی ہے۔

جو مسلمان حج کو نہیں جاسکے، عشرۂ ذی الحجہ کی خیر و برکت اور یوم عرفہ کے روزہ کے ثواب کے ساتھ، صاحب حیثیت کے لیے قربانی کا وہ ماحول عطا کیا جس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے مالک حقیقی کے حکم کی تعمیل میں اپنے جگر گوشہ کی گردن پر چھری چلا کر پیش کیا ہے، مالک نے اپنے صاحب نصاب بندوں پر قربانی فرض کرکے حج کے دنوں میں پہلی ذی الحجہ سے دسویں ذی الحجہ تک جب تک اپنی قربانی نہ کرلیں، حاجیوں کی مشابہت اپنانے اور اس یاد کو دیارِ حرم سے دور رہتے ہوئے بھی تازہ کرنے کے لیے بال کٹوانے، ناخن ترشوانے سے رکے رہنے کو افضل قرار دیا ہے حتی کہ اپنی قربانی کرلیں، جو مسلمان قربانی کی بھی حیثیت نہیں رکھتے، ان کے لیے بھی ان دس دنوں کی خیر و برکت روزہ اور نوافل کے ذریعہ حاصل کرنے کے لیے رحمت خداوندی کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔

حج کے تمام شعائر اس محبوبِ حقیقی کی محبت میں دیوانہ وار پھرنے کی ان عاشقانہ اداؤں کو تازہ کرتے ہیں، جو حضرت ہاجرہ کی صفا و مروہ کے درمیان سات چکر لگانے، اسماعیلؑ ذبیح اللہ کو ذبح کے لیے لے جانے کے وقت ابلیس کے بہکانے پر

حضرت ابراہیمؑ کے کنکری مارنے، منیٰ ومزدلفہ اور قیام عرفہ کی صورت میں ادا ہوتے ہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ''اگر اللہ تعالیٰ سے لقا کا شوق ہے تو مسلمان اس کے اسباب ووسائل اختیار کرنے پر لامحالہ مجبور ہوگا، عاشق اور محبّ ہر اس چیز کا مشتاق ہوتا ہے، جس کا تعلق اس کے محبوب سے ہو، کعبہ کی نسبت اللہ عزوجل کی طرف ہے، اس لیے مسلمان کو قدرتی طور پر اس کا سب سے زیادہ مشتاق ہونا چاہیے، علاوہ اس اجر وثواب کے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے''۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ بھی اسی نکتہ کو حج کی بنیادی حکمت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کبھی کبھی انسان کو اپنے رب کی طرف غایت درجہ اشتیاق ہوتا ہے، اور محبت جوش مارتی ہے، اور وہ اس شوق کی تکمیل کے لیے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سامان صرف حج ہے''۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی کتاب 'ارکان اربعہ' میں لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ اس امت کے نازک سے نازک دور اور تاریک سے تاریک زمانہ میں بھی وہ حج کو ان بابرکت ہستیوں سے کبھی محروم نہ رکھے گا، جن کو ہم علماء حق، مقبولین بارگاہ، اہل دعوت واصلاح اور اہل باطن واہل قلوب کہتے ہیں اور جن کی وجہ سے حج کی فضا روحانیت اور نورانیت سے اس قدر بھر جاتی ہے کہ سخت سے سخت دل بھی موم اور پتھر جیسے جگر بھی پانی ہوجاتے ہیں، باغی اور نافرمان بھی توبہ وانابت کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں، وہ آنکھیں جن سے خوف یا محبت کے دو قطرے بھی نہ ٹپکے تھے، یہاں پہنچ کر بے ساختہ اشکبار ہوجاتی ہیں، دل کی سرد انگیٹھیاں ایک بار پھر سلگ اٹھتی ہیں، رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے، اور سکینہ پورے ماحول کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے، شیطان کو منہ چھپانے کی بھی جگہ نہیں ملتی، حدیث شریف میں آتا ہے کہ: ''شیطان عرفہ کے دن سے زیادہ حقیر وذلیل، راندۂ درگاہ اور غصہ سے جلا بھنا ہوا کبھی نہیں دیکھا گیا، اور صرف اس وجہ سے کہ وہ دیکھتا ہے کہ رحمت الٰہی نازل ہورہی ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے بڑے گناہوں کو معاف فرمارہا ہے''۔

حاجیوں میں حاکم ومحکوم، آقا وغلام، امیر وفقیر، اور چھوٹے بڑے کا کوئی فرق نہیں ہوتا، سب ایک ہی چادر ولنگی میں نظر آتے ہیں، اور سب ایک ہی آواز لگاتے ہیں: ''اے اللہ! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، ساری تعریفیں اور نعمتیں تیرے ہی لیے زیبا ہیں، اور حکومت وبادشاہت میں بھی تیرا کوئی شریک نہیں''۔

صفا ومروہ کی پہاڑیوں پر سب ساتھ دوڑتے ہیں، منیٰ وعرفات سب ساتھ جاتے ہیں، جبل رحمت پر ایک ساتھ حاضر ہوکر دعا کرتے ہیں اور ایک جگہ رات گزارتے ہیں، قربانی کرنا، سر منڈانا، اور شیطان کو کنکری مارنا، یہ مستانہ ادائیں ایک ساتھ ادا کی جاتی ہیں، یہی راز ہے حاجی کی اس فضیلت کا کہ حج کے بعد وہ گناہوں سے اس طرح پاک صاف ہوجاتا ہے جیسے آج ہی پیدا ہوا ہو۔

☆☆☆☆☆

سراغِ زندگی

عزم صادق اور اخلاص ہر کامیابی کی کلید

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں نئے تعلیمی سال کے آغاز پر ۶ / مارچ ۱۹۶۵ء کو کی گئی اہم تقریر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

عزیز طلبہ!

یہ آپ کا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، اور ہر طرح مناسب ہے کہ سال کے شروع میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کی جائیں، اور قیام وتعلیم کے کچھ مشورے دیے جائیں، آپ کو زیادہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ جو اچھی سے اچھی باتیں ہوسکتی ہیں، اور زندگی کے سارے مطالعے اور تجربات کا نچوڑ ہوسکتا ہے، وہ آپ کے سامنے رکھا جائے گا، اس لیے کہ ہر وہ قیمتی سے قیمتی بات جو برسوں کے تجربہ کے بعد حاصل ہوتی ہے اور جو مدتوں سے سینے میں امانت ہے، اگر آپ سے اس وقت نہ کہہ دی جائے تو کس وقت اور کس موقع پر کہی جائے گی؟ میرے نزدیک آپ سے زیادہ اس کا کوئی حقدار نہیں ہے۔

یوں تو باتیں بہت کچھ کہنے کی ہیں، لیکن میں جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ مجھے ان عزیز طلبہ سے خطاب کرنا ہے جو بہت دور سے اپنے سینوں میں بہت سی امیدیں لے کر آئے ہیں، اور جن کے والدین نے بہت سی توقعات وابستہ کر کے ان کو بھیجا ہے، تو مجھے اچھی خاصی کشمکش پیش آتی ہے، کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، پھر بھی ہر چیز کی ایک خوراک ہے، اگر خوراک سے زیادہ دوا دی جائے تو بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوتا ہے، میرا تجربہ ہے کہ جب باتیں زیادہ ہوتی ہیں تو انسان کا ذہن ان کو برداشت نہیں کر پاتا، اور وہ اس کو بھول جاتا ہے، اس لیے اگرچہ میرے ذہن میں اس وقت بہت سی باتیں ہیں، لیکن میں ان میں سب سے اہم اور ضروری باتیں کہوں گا۔

سارا دارومدار آپ کی محنت اور طلب پر ہے

پہلی بات یہ ہے کہ عام طور سے جب کسی مدرسہ میں طلبہ کا استقبال کیا جاتا ہے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ اس مدرسے میں آپ کے مقصد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کا سامان مہیا ہے، بہترین اساتذہ موجود ہیں، شفیق مربی ہیں، کھانے اور رہنے کا معقول انتظام ہے، اور سب سے بڑھ کر تعلیم کا ماحول ہے، لیکن میں آج آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ اس مدرسہ کی کیا خصوصیات ہیں، یہاں کیسے کیسے فاضل اساتذہ موجود ہیں، تعلیم وتربیت کا کیا سامان مہیا ہے، کتنا وسیع کتب خانہ ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تمام باتوں کا یہاں معقول ترین انتظام ہے، میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں؛ لیکن میں جان بوجھ کر آپ سے یہ باتیں نہیں کہوں گا، اس لیے کہ اس سے وہ قوت ارادی ظاہر نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے، اس سے طالب علم کے اندر اطمینان کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں جس حالت میں بھی رہوں، ارادہ کروں یا نہ کروں، درس میں محنت کروں یا نہ کروں، منزل مقصود پر بہرحال پہنچ جاؤں گا۔

میں اس وقت اپنے لیے ایک نازک راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں، جو ممکن ہے میرے حق میں مضر ہو؛ لیکن میں بصراحت کہتا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی ہوگا، وہ آپ کی محنت، جذبہ اور عزم سے ہوگا، اگر مجھے یہ اطمینان ہوتا کہ آپ کشمکش اور غلط فہمی میں نہیں پڑ جائیں گے، تو میں کہتا کہ یہاں آپ کو عالم فاضل بنانے کے لیے یا آپ کی امیدوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی سامان نہیں؛ لیکن اس پر زور دینے سے اندیشہ ہے کہ معلوم نہیں آپ کیا سمجھ بیٹھیں، آپ میں ہر قسم کے لڑکے ہیں، بڑے بھی ہیں اور چھوٹے بھی ہیں، ذہنوں میں تفاوت ہے، پھر بھی بالکل صفائی سے کہوں گا کہ یہاں جو کچھ بھی ہوگا، آپ کی محنت سے ہوگا، آپ کے جذبہ اور عمل سے ہوگا، اگر آپ کے اندر یہ جذبہ ہے کہ آپ یہاں سے عالم فاضل بن کر جائیں، علوم اسلامیہ کی خدمت کریں، دنیا کے گوشے گوشے میں دین کی اشاعت کریں، علوم اسلامیہ کے کسی شعبہ میں مہارت پیدا کرنا چاہیں تو یہ آپ ہی کی محنت سے ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں ہوسکتی، میرا تاریخی تجربہ ہے اور آپ بھی جب کبھی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوں گے تو آپ کو تاریخ میں کچھ شخصیتیں ابھری ہوئی نظر آئیں گی، تاریخ میں بھی اونچ نیچ ہے، جس طرح آپ کی زمین اونچی نیچی ہے، اسی طرح تاریخ بھی ہے، تاریخ میں آپ کو کچھ شخصیتیں نظر آتی ہیں جو آپ کے سامنے مجسم بن کر کھڑی ہوجاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد و قامت اور عظمت کے پیچھے ہماری پوری تاریخ چھپ گئی ہے، یہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے اپنی محنت وطلب سے یہ کمال پیدا کیا اور جو کچھ بھی

حاصل کیا اپنے عزم سے حاصل کیا، بے شک تاریخ میں ان کے اساتذہ کا بھی تذکرہ ملے گا، تاریخ یہ بھی بتائے گی کہ ان پر ان کے اساتذہ کا بڑا احسان ہے؛ لیکن اگر آپ ان کی آواز سن سکیں اور ان کا جذبۂ احسان مندی وتشکر اس کی اجازت دے تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ عزیزو! اساتذہ کے فیض کا انکار نہیں ہے، لیکن ہمیں جو کچھ ملا ہے ہماری محنت سے اور ہمارے عزم سے ملا ہے، اور تمہارے لیے کارآمد بات یہی ہے، صحابہ کو چھوڑ کر، اس لیے کہ وہ حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کیمیا اثر صحبت کا ثمرہ تھے، تم جس فرد کو بھی دیکھو، تمہیں صاف نظر آئے گا کہ جو کچھ بھی کسی کو ملا ہے وہ اس کو اپنی محنت سے ملا ہے۔

عزیزو! تمہارے لیے لکھ لینے کی بات ہے، اگر اس پورے مجمع میں دو چار دس آدمی ایسے ہوتے جو تمہارے مستقبل کو دیکھ سکتے تو انھیں یہ معلوم ہوتا کہ تم میں جو بھی باکمال نکلیں گے، وہ وہی ہوں گے جنھوں نے آج ہی عزم کرلیا ہے کہ انھیں ساری مشکلات کے باوجود، ساری رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہوتے ہوئے، تمام مصائب وآلام کا سامنا کرتے ہوئے باکمال اور صاحب فیض بن کر نکلنا ہے۔

اللہ کا ایک قانون

اگر تمہارے اساتذہ، تمہارے والدین، تمہارا پورا ماحول، غرض کہ دار العلوم کا ذرہ ذرہ یہ طے کر لے کہ فلاں کو امام غزالی بنانا ہے، اول تو کوئی یہ دعوی نہیں کرسکتا، اور نہ کوئی یہاں امام الحرمین جیسا ہے جس نے امام غزالی جیسا حجۃ الاسلام بنادیا، لیکن اگر دار العلوم ندوۃ العلماء کے سارے ارکان انتظامی بھی یہ طے کرلیں کہ وہ اپنا سارا کاروبار چھوڑ کر، اپنی ساری مصروفیات کو پس پشت ڈال کر زید، عمر، بکر یا کسی بھی طالب علم کو امام غزالی بنا کر دم لیں گے، اور وہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں چلے آئیں، اور اللہ کے فضل سے ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، ایسے بہت سے اللہ کے بندے موجود ہیں کہ اگر ان کے کان میں ادنیٰ سی بھنک بھی پڑ جائے کہ ان کے یہاں چلے آنے سے ان کا لڑکا اور ان کا چشم وچراغ صاحب فیض ہوجائے گا، تو وہ اس میں ادنیٰ تامل نہیں کریں گے، اور فوراً ساری مصروفیات کو خیر باد کہہ کر یہاں آجائیں گے، اگر اس باغ کا پتہ پتہ اور زمین کا ذرہ ذرہ غرض کہ ساری خارجی اور داخلی طاقتیں مل کر ایک آدمی پر محنت کریں اور چاہیں کہ تم ایک صالح مخلص اور باعمل بن کر نکلو تو ایسا نہیں ہوسکتا، یہ اللہ کا قانون ہے کہ اس نے ہر انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں کہ جس کو باکمال بننا ہے، اس کے اندر عزم کی صلاحیت بھی ہے، یہ فیض الٰہی ہی نہیں، عدل الٰہی کے عین مطابق ہے، اس نے والدین پر بوجھ نہیں ڈالا، اساتذہ پر ذمہ داری نہیں عائد کی، یہ قانون الٰہی نہیں کہ درخت کوئی لگائے اور پھل کوئی کھائے، جس کو پھل کھانا ہے، اسی کو درخت لگانا ہے اور اس کی آبیاری بھی کرنا ہے، اس لیے میرے عزیزو! یہ تمہاری بڑی ذمہ داری ہے، تمہارے والدین کی دعائیں بیشک مستجاب ہیں، تمہارے اساتذہ کی دعائیں اور دوائیں بے شک کارگر ہیں، کسی مدرسے کا حسن انتظام، کتب خانہ کی وسعت اور خارجی انتظامات ان سب کا اثر پڑتا ہے؛ لیکن یہ سب مل کر اگر چاہیں کہ کسی کو عالم بنادیں تو نہیں کرسکتے۔

عزم و ارادہ

اگرچہ اس وقت میں اس مدرسہ کی حق تلفی کررہا ہوں، اور اس کے ساتھ ناانصافی کررہا ہوں؛ لیکن میں تم سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم یہ سمجھ کر آئے ہو کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ بہت باکمال ہیں، اس کی شہرت بہت زیادہ ہے، یہاں کی سندیں بڑی بڑی جامعات اور یونیورسٹیوں میں مقبول ہیں، یہاں کی تاریخ بہت روشن ہے، اگر تم نے اس میں سے کسی بات پر تکیہ کیا تو تم اسی وقت اس غلط فہمی کو دور کرلو، مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ تم میں سے دو چار دس لڑکے جو اس امید پر آئے تھے واپس چلے جائیں گے، میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ اگر تمہارا خیال ہے، محض دروس میں شریک ہونے سے، یہاں رہنے سے، یہاں کی کتابوں کی ورق گردانی سے تم منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے، تو اس غلط فہمی کو اسی وقت دور کرلو۔

ہاں اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ اگر یہ سارا ماحول مل کر میری مخالفت کرے، میرے راستے میں روڑے اٹکائے؛ لیکن جب تک میری جان میں جان ہے، میں نے عزم کرلیا ہے کہ یہاں سے باکمال اور صاحب فیض بن کر نکلوں گا، میں وہ شخصیت بن کر نکلوں گا جو اس امت کو اس پُرفتن دور میں مطلوب ہے، یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید، اگر تم نے یہ عزم کرلیا ہے تو تمہارے لیے سب کچھ یہیں ہے، تمہارا مکہ یہیں ہے، تمہارا مدینہ یہیں ہے، شام ومصر کا نام کیا لوں، میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں، اور ہر وادی سے گزر چکا ہوں:

مرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق ومغرب کے میخانے

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سرزمین تمہارے لیے متبرک ہے، یہ کنواں جو تم دیکھ رہے ہو، یہ زمزم کا کنواں ہے، یہ مسجد جس کے مینارے نظر آرہے

ہیں، نعوذ باللہ بیت اللہ ہے، ایسا تو کوئی کافر ہی کہہ سکتا ہے، بلکہ یہ ایک عام شہر ہے جو معصیتوں اور آلائشوں سے پر ہے، فتنوں اور ظلمتوں سے پر ہے؛ لیکن میں ایک بار کہوں گا کہ تمہارا مکہ یہیں ہے، تمہارا مدینہ یہیں ہے، تمہیں مکہ تک پہنچانے والا راستہ یہیں سے ہوکر گزرا ہے، بلکہ تمہیں علم نبوی کے خزانے تک پہنچانے والا راستہ یہیں ہے۔

اگر تم نے ندوہ کو شیطان کے محل تک پہنچنے کا ایک پل نہیں سمجھا، اگر تم نے یہ نہیں سوچا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سیکھ کر، حضرت عمرو حضرت خالد (رضی اللہ عنہما) کی زبان سیکھ کر -جن کی ایک لغزش مستانہ نے ساری دنیا کو ہلا دیا- دنیا کے ٹھیکروں کے حصول کا ایک ذریعہ بناؤ، اگر تم بت خانہ کے آزر نہیں بننا چاہتے تو میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کو ابراہیم تک پہنچانے والا راستہ یہی ہے، یہاں سے تم سیدھے بیت اللہ تک جاسکتے ہو، تمہاری عظمت کا خزانہ یہیں ہے، اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ تمہیں یہ خزانہ تلاش کرنا ہے، اپنا خون پسینہ بہا کر اپنے سینہ پر تیشہ چلا کر، تو تمہیں اپنی روزی یہیں ملے گی۔

میرے عزیزو! اسی زمین کے اندر تمہاری قسمت کا خزانہ دفن ہے، اگر تم نکالنا چاہتے ہو تو یہیں سے نکال سکتے ہو، اگر تمہیں نہیں نکالنا ہے تو حرم کی متبرک زمین بھی تمہیں نکال کر نہیں دے گی، اگر تم غزالی و رازی بننا چاہتے ہو، بات تو بہت بڑی ہے، چھوٹا منھ بڑی بات؛ لیکن اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ تمہیں غزالی و رازی بننا ہے تو تم یہیں بن سکتے ہو۔

افسوس ہے کہ آج ہمارے مدرسوں میں تو بے دین پیدا ہورہے ہیں، تارک الصلاۃ پیدا ہورہے ہیں، اور یونیورسٹیوں میں، لندن و فرانس کے کالجوں میں، یاجوجیت و ماجوجیت کی آغوش میں، بتکدۂ آزری میں ابراہیم پیدا ہورہے ہیں، جس طرح آزر کی گود میں ابراہیم پیدا ہوئے، اسی طرح آج یورپ کے بتکدے میں ابراہیم کی دعوت کے حاملین پیدا ہورہے ہیں۔

میرے عزیزو! تاریخ میں جتنی بھی عظیم شخصیتیں نظر آرہی ہیں، ان کے ساتھ ان کے اساتذہ کا بھی تذکرہ ہے اور ہونا بھی چاہیے، دنیا اتنی احسان فراموش نہیں ہے اور مستقبل کا مؤرخ بھی جب تمہاری سوانح لکھے گا تو وہ تمہارے اساتذہ کا تذکرہ ضرور کرے گا؛ لیکن یہ یاد رکھو کہ بغیر تمہارے عزم کے اور بلا تمہاری محنت کے کچھ بھی نہیں ہوسکتا، میں دس سال تک ندوہ میں درس دے چکا ہوں، اور پندرہ سال سے معتمدی و نظامت کے کاموں سے متعلق رہا ہوں، میری اس پچیس سالہ تدریسی و تنظیمی زندگی کا تجربہ ہے، اساتذہ کو جتنا تجربہ ہوتا ہے وہ کسی بھی بڑے سے بڑے ماہر نفسیات کو نہیں ہوسکتا، مجھے معلوم ہے کہ کتنے ہی بچے آتے ہیں، ان کے ساتھ ان کے سرپرست آتے ہیں، اس طرح سفارش کرتے ہیں کہ دل بھر آتا ہے، اور ان کو داخل کرنے کے بعد بھی طرح طرح سے ہدایا بھیج کر خطوط کے ذریعہ توجہ دلاتے رہتے ہیں؛ لیکن وہ بچے بالکل ناکارہ ہوتے ہیں، اس کے برعکس بہت سے بچے ایسے آتے ہیں جو بالکل گمنام ہوتے ہیں، لاوارث ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ان کا کوئی سرپرست بھی نہیں آتا، ادھر ادھر سے پوچھ کر داخلہ لے لیتے ہیں، لیکن وہ باکمال ہوکر جاتے ہیں، اور جب کوئی امتیاز پیدا کرتے ہیں، تب میں ان سے واقف ہوتا ہوں، اساتذہ چاہیں، والدین چاہیں؛ لیکن بچہ نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، اور اگر کوئی نہ چاہے؛ لیکن بچہ چاہے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔

میرے عزیزو! اگر کوئی لاکھ چاہے کہ میرا بیٹا ایسا ہوجائے اور بیٹے نے نہیں چاہا تو ایسا نہیں ہوسکتا، کتنے ہی علم دوست بلکہ عالم بادشاہ گزرے ہیں، کیا انھوں نے نہیں چاہا ہوگا کہ میرا بیٹا بھی عالم ہوجائے؟ دور مت جائیے، اورنگ زیب ہی کو دیکھ لیجیے، اشوک و اکبر کے بعد کوئی بھی بادشاہ اتنے بڑے تخت کا مالک نہ رہا ہوگا، اور اتنا بڑا علم دوست اور ذی علم بادشاہ کم از کم دہلی کے تخت پر نہ بیٹھا ہوگا، اس نے ملک کے بڑے بڑے علماء کو جمع کرکے فتاویٰ ہندیہ (جس کو فتاوی عالمگیری بھی کہتے ہیں) مرتب کرادیا، کیا وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا یا نہ کیا ہوگا کہ ان میں چند علماء کو منتخب کرکے اپنے لڑکے اعظم شاہ یا معظم شاہ کی تعلیم پر مقرر کردے؛ لیکن ان کی اولاد میں کوئی بھی عالم نہ ہوا، کتنے ہی ایسے علماء گزرے ہیں جو عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عالم گر اور عالم ساز تھے؛ لیکن ان کی اولاد عالم نہ ہوسکی، کیا انھوں نے نہ چاہا ہوگا کہ ان کا بیٹا بھی عالم ہوجائے، اور سب سے آخر میں حضرت نوح (علیہ السلام) کی مثال لے لیجیے، جس کے بعد اور کوئی مثال نہیں ہوسکتی، وہ اپنے بیٹے کو نہ شریک حیات کرسکے اور نہ شریک آخرت۔

میرے عزیزو! تم یہ بات لکھ لو کہ اگر تم نے ارادہ کرلیا ہے کہ یہاں سے استعداد پیدا کرکے نکلنا ہے تو تم ان شاء اللہ کامیاب ہوگے، میں دیکھ رہا ہوں، تم میں کچھ ایسے طلبہ ہیں جو اس پرآشوب اور معصیت افزوں دور میں صاحب کمال بن

کرنکلیں گے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت عربی زبان و ادب کا جو نصاب موجود ہے، اس سے بہتر نصاب کبھی ہندوستان میں نہیں تھا، یہ میرے گھر کا موضوع ہے، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں، خود دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی زبان و ادب کا اس سے بہتر نصاب نہیں ہوسکا، جیسا کہ اس وقت ہے، نہ عربی زبان وادب کے استعمال کرنے والے ایسے تھے جیسے اس زمانہ میں ہیں، جب میں آج سے بیس پچیس سال پہلے خود ندوہ کا نصاب دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عربی زبان سے واقف کرانے کے لیے اس نصاب کو کیسے رکھا گیا؛ لیکن اس نصاب کو پڑھ کر سید سلیمان ندوی نکلے جو علم میں اپنے اکثر اساتذہ سے کہیں آگے تھے، اسی نصاب کو پڑھ کر مولانا مسعود عالم ندوی نکلے جن کو خط لکھتے ہوئے ایک بہت بڑے مستشرق نے لکھا کہ میں آپ کو علامہ لکھ رہا ہوں، اگرچہ آپ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے ہیں؛ لیکن آپ کا علم مجھے علامہ لکھنے پر مجبور کررہا ہے، اسی نصاب کو پڑھ کر مولانا محمد ناظم ندوی نکلے جن کا آج پورے پاکستان میں جواب نہیں، یہ وہ علماء ہیں جن کا عالم عربی کے ادباء لوہا مان گئے، حالانکہ اس وقت عربی کا ناقص نصاب تھا، لکھنے پڑھنے کے ایسے وسائل مہیا نہیں تھے، نہ کسی عرب سے ملاقات کی نوبت آتی تھی، مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مولوی گنج میں ایک عرب آئے تھے تو ہم لوگ شد رحال کرکے ان سے ملاقات کرنے گئے تھے؛ لیکن آج تم گھر بیٹھے ریڈیو سن سکتے ہو، اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین پڑھ سکتے ہو، وقتاً فوقتاً عرب وفود سے ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے، پھر کیا بات ہے کہ تم میں کوئی مسعود عالم ندوی جیسا اہل قلم پیدا نہیں ہوتا؟ اس کا صرف ایک جواب ہے، وہ یہ کہ ان کو ایک جنون تھا کہ عربی کے اعلیٰ سے اعلیٰ صحافی بنیں، ان کو عربی لکھنے پڑھنے سے دلچسپی تھی، اس لیے وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچے؛ لیکن آج اتنی آسانیاں ہیں اس کے باوجود تمہاری انشاء کی کاپیاں یا مقالے دیکھتا ہوں تو ڈرنے لگتا ہوں کہ میں خدا کو کیا جواب دوں گا؟ وجہ یہی ہے کہ وہاں عزم تھا یہاں عزم نہیں ہے، وہاں ارادہ تھا یہاں ارادہ نہیں ہے۔

صاحبِ فیض کی صحبت کی ضرورت

میرے عزیزو! دوسری بات یہ ہے کہ علماء اسلام نے بلاشبہ اپنی تصنیفات میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے، وہ آسمان سے تارے توڑ کر لائے ہیں، اور ان کو کتابوں میں بند کردیا ہے، اسلام کو یہ فخر ہے کہ اس امت میں ایسے لاتعداد علماء و مصنّفین پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے سمندروں کو کوزے میں بند کردیا ہے، مصنّفین اسلام کی یہ ساری تحقیق وجستجو تسلیم، مگر قرآن و حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے میں اعلان کرتا ہوں کہ انسان کے سینے میں جو علوم وفنون موجود ہیں، ان کا ہزارواں حصہ بھی کتابوں میں نہیں آسکا ہے، میری یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ نے انسان کے ذہن، قلب اور دماغ میں جو کمالات ودیعت کیے ہیں، یہ سارے علوم وفنون ان کی ایک فیصدی بھی نمائندگی نہیں کرسکتے، اس لیے کہ جو کچھ ملا ہے وہ انسانوں سے ملا ہے، ہم نے اپنے سارے تجربات کا نچوڑ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور برابر تمہارے نصاب میں ضرورت کے مطابق ترمیم کرتے رہتے ہیں، اور ہمیں یہ اعتماد ہے کہ اس زمانہ میں بہتر سے بہتر جو نصاب ہوسکتا ہے وہ موجود ہے؛ لیکن سمجھ لو کہ تم کو جو کچھ انسان سے مل سکتا ہے وہ کتابوں سے نہیں، ایک صاحب فیض کی صحبت، صرف تھوڑی دیر کی صحبت وہ فیض پیدا کرسکتی ہے جو ان سارے کتب خانوں میں نہیں ہے، یہ تسلیم ہے کہ تم اپنے اپنے دماغوں میں علوم وفنون کا خزانہ جمع کرلو؛ لیکن یہ خزانہ کبھی الحاد وزندقہ کا سبب بھی بن سکتا ہے، اگر اس کے مصرف کو سمجھنا ہے تو یہ کسی انسان کی صحبت سے حاصل ہوگا، ہر چیز کو فائدہ مند بنانے والا اکسیر ذوق ہے، تم بہتر سے بہتر کتابیں پڑھ سکتے ہو؛ لیکن اس کا کیا علاج کہ تم پڑھتے ہو مگر تم میں کوئی اثر نہیں ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارے اندر وہ ذوق نہیں ہے، تم تاریخ میں نشیب وفراز دیکھتے ہو، کوئی امام غزالی ہے اور کسی کا ہم نام بھی نہیں جانتے، کوئی ابن تیمیہ ہے، اور ان کے زمانے میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو علم وفضل میں ان سے بڑے تھے؛ لیکن ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، فرق معلومات کا نہیں ہے، نگاہ اور ذوق کا فرق ہے، وہی کتاب الٰہی (اور کسی کتاب کا نام کیا لوں) شیخ عبدالقادر جیلانی نے پڑھی اور وہی ان کے معاصروں نے؛ لیکن ان کی عظمت کا راز معلومات نہیں ہیں، وہ فرق فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کا ہے، اور اثر وتاثر کا ہے جو ان کے اندر کتاب اللہ پڑھنے سے ہوتا ہے۔

میرے عزیزو! میں مانتا ہوں کہ تم نے بہت کچھ پڑھ لیا، تم نے تفسیر میں، فقہ میں یا حدیث میں مہارت حاصل کرلی، تقریر بھی سیکھ لی، تحریر کی بھی صلاحیت آگئی، لیکن وہ ذوق کہاں سے لاؤ گے جو قلب میں تاثر پیدا کردے اور تم کو تڑپا دے:

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرور عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اصل چیز یہ ذوق ہے جس سے تم اچھے برے کو سمجھنے لگو، اور تم میں وہ اخلاص پیدا ہو جائے کہ تم ہر چیز کو اپنے مقصد کے تابع کر لو، اور یہ چیز صحبت سے حاصل ہوتی ہے، تم سمجھتے ہو کہ چند کتابوں کے پڑھنے سے یا درس میں شریک ہونے سے تم باکمال بن جاؤ گے، ایسا ہرگز نہیں، تم کو ایسے لوگوں کی صحبت کی ضرورت ہے جن کی ایک نظر سے تم بہت سی ایسی چیزوں سے واقف ہو جاؤ جو محض تجربہ کا نتیجہ ہیں، تم اپنے اساتذہ کی صحبت کو غنیمت جانو، اور اس سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

ناشائستہ کاموں سے اجتناب

تیسری بات یہ ہے کہ اس موقع پر مجھ سے یہ توقع کی جاتی ہے اور بجا بھی ہے کہ میں تم سے کہوں کہ تم ایک دینی درسگاہ کے طالب علم ہو، تم میں فلاں فلاں کمزوریاں نہیں ہونی چاہئیں، تم اس درسگاہ کے طالب علم ہو جس سے سید سلیمان ندوی نکلے، مولانا عبدالباری ندوی نکلے، کیا تم سے ایسی امید کی جاسکتی ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت کرو گے جو تمہارے مقصد کے خلاف ہے؟ اگرچہ تجربے نے مجبور کر دیا ہے کہ تم کو ان باتوں سے منع کیا جائے؛ لیکن پھر بھی میں گوارا نہیں کر سکتا کہ تم سے ایسی بات کہوں، اور اگر میں یہ کہوں تو تم کو احتجاج کرنا چاہیے کہ حضرت ہم ایسے گئے گزرے نہیں ہیں کہ ہم کو ان باتوں سے منع کیا جائے، اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے شہزادہ کو سمجھائے جس کے خاندان میں پشتہا پشت سے سلطنت چلی آرہی ہو، اور اس سے کہے: میاں! دیکھو کہیں سڑک پر گری پڑی چیزیں نہ اٹھا کے کھانا، کبھی گری پڑی ہڈیوں کو نہ چبانا، کسی بھنگی کے دسترخوان پر کھانا نہ کھانا، تو اس کا انجام کیا ہوگا کہ وہ مار کر دربار سے نکال دیا جائے گا، تمہاری شان اس سے بھی بلند ہے، تمہارا تعلق سرچشمۂ نبوت سے ہے، تم نبوت کے دسترخوان کے مہمان ہو، جب اس شخص سے اس قسم کی باتیں نہیں کہی جاسکتیں تو پھر تم لوگوں سے کیسے کہی جائیں؟

میں اپنی گفتگو ختم کر رہا ہوں اور آخر میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ آپ کا مکہ یہیں ہے، آپ کا مدینہ یہیں ہے، آپ کو عزم کی ضرورت ہے، میں نے شام و مصر بھی دیکھا ہے، جامعہ ازہر اور جامعہ دمشق کو بھی دیکھا ہے، اور میں بہت سی جگہوں کا مشیر بھی ہوں، بہت سی جگہوں کی عاملہ میں ہوں، میں تم کو مدینہ جانے سے نہیں روکتا، اتنا ضرور کہتا ہوں کہ تم پہلے اپنے اندر مدینہ جانے کی صلاحیت پیدا کر لو، تم وقت سے پہلے نہ پکو، پہلے اپنے اساتذہ کی سند حاصل کرو، اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرو، اور ہم کو مجبور کر دو کہ ہم لوگ تم سے خود کہنے لگیں کہ اب تم مدینہ جاسکتے ہو، کسی ایک نحوی نے دوسرے نحوی پر اعتراض کیا تو اس نے جواب دیا: قد زبیت قبل أن تحصرم، تم گدر ہونے سے پہلے پک گئے، کہیں تم بھی ایسے ہی نہ ہو جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں جانے پر یہ صدا آئے:

بہ طواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند
تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

میرے عزیزو! تمہاری عظمتوں کا خزانہ یہیں دفن ہے، تم اس کو یہیں رہ کر برآمد کر سکتے ہو، اور اس کو اپنے لیے، سارے ملک کے لیے، عالم اسلام کے لیے اور پوری انسانیت کے لیے مفید بنا سکتے ہو۔

☆☆☆☆☆

اولاد کی تربیت

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

آج کل لوگ اپنی اولاد کی ایسی تربیت کرتے ہیں جیسا قصائی گائے کی تربیت کرتا ہے کہ اس کو کھلاتا ہے پلاتا ہے، حتیٰ کی وہ خوب موٹی تازی ہو جاتی ہے؛ لیکن غرض اور مآل اسکا یہ ہوتا ہے کہ اس کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے، اسی طرح یہ لوگ اپنی اولاد کی خوب زیب و زینت، تعیش میں پرورش کرتے ہیں اور انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ لقمۂ جہنم ہوتے ہیں اور ان کی بدولت مربی کی بھی گردن ناپی جاتی ہے کیونکہ اس تعیش کی بدولت اولاد کو نہ نماز کی خبر ہوتی ہے اور نہ روزے کی اور بعض نامعقول تو حد سے گذر جاتے ہیں کہ ان کو اسلام کی کسی بھی بات کی خبر نہیں ہوتی۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ اسکولوں میں جو بچے پڑھتے ہیں، ان کو تعطیلات میں اللہ والوں کی صحبت میں رکھا جائے، خواہ وہاں جا کر نماز بھی نہ پڑھیں مگر عقائد و خیالات تو درست ہوں گے، اب تو آزادی بے حد ہو رہی ہے جو پہلے انگریزی خوانوں میں نہ تھی، وجہ یہ ہے کہ ان کی پرورش دینداروں کی آغوش میں ہوتی تھی اور اب انگریزی خوانوں کی آغوش میں ہوتی ہے، آگے اور زیادہ اندیشہ ہو رہا ہے، یہ سنبھالنے کا وقت ہے، بڑا نازک وقت ہے۔

☆☆☆

نعمتِ ربانی

حج ایک خاص لذت و کیفیت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

حج اسلام کا پانچواں رکن ہے، ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے، وہ اسلام کی ایسی ہی عبادت ہے جیسی کہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ، صاحبِ استطاعت مسلمان پر اس کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی ہے۔

حج کی ادائیگی میں عبادت کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ جو دینی وروحانی منافع ہیں وہ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ مسلمان کی زندگی کی دینی واسلامی تربیت و رہنمائی میں اس کا بڑا حصہ ہے اور متعدد دینی فائدے ایسے ہیں جو صرف اسی عبادت کی ادائیگی سے حاصل ہوتے ہیں، حج مکہ سے عرفات تک کے خطہ میں انجام دیا جاتا ہے، یہاں دنیا کے خطہ خطہ سے مسلمان اکٹھا ہوتے ہیں، اور سب اپنے بے شمار اختلافات اور فروق کے باوجود ایک جیسے ہوجاتے ہیں، اور کیوں نہ ہوں، سب ایک ہی پروردگار کے بندے اور ایک مورث نبی حضرت آدمؑ کی اولاد، ایک نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے اور ایک دین اسلام کے پیرو ہیں، تو پھر یکسانی اور وحدت کیوں نہ ہو، اور اگر ہر جگہ اور ہر وقت یہ ممکن نہ ہو تو ایک خاص جگہ اور ایک متعینہ وقت میں تو ضرور کرلی جائے تاکہ اس وحدت یک جہتی اور یکسانی کا مظاہرہ اور عمل کبھی تو ہوجائے اور اس کے جو دینی وروحانی فائدے ہیں وہ حاصل ہوسکیں۔

تمام مسلمان اپنے ہر طرح کے فروق کے باوجود ایک ملت ہیں، اور یہ اس ملت کا ایسا امتیاز ہے جس میں دنیا کی کوئی دوسری امت اس کی ہمسر نہیں، ملتِ اسلامی کے اس امتیاز کے بقاء میں حج کا بڑا دخل ہے۔

جب ہندوستان کا مسلمان اپنے کرتے پاجامہ میں، انڈونیشیا کا مسلمان اپنی بشرٹ اور لنگی میں، عرب کا مسلمان اپنے لانبے کرتے میں اور افریقہ کا مسلمان اپنے ڈھیلے اور لانبے انگرکھے میں، ترکی کا مسلمان ترکی کوٹ پتلون میں، اور افریقہ و یورپ اور دیگر علاقوں کے مسلمان اپنے رنگ برنگے، طرح طرح کی کاٹ رکھنے والی لباس میں مکہ کی جانب روانہ ہوتے ہیں اور حج کے لیے سب اپنے انواع واقسام کے لباسوں کو اتار کر صرف دو سفید چادروں میں ملبوس ہوجاتے ہیں، تو سوائے جسمانی قدوڈیل ڈول یا چہرے کے رنگ کے فرق کے سب فرق مٹ جاتے ہیں، اور اس عظیم عمل کا ظہور ہوتا ہے کہ ایک پروردگار کے سامنے اس کے سب ماننے والے ایک بندے کی طرح حاضر ہیں، سب کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ یہ ہوتے ہیں:

”حاضر ہوں تیرے سامنے اے پروردگار! حاضر ہوں تیرے سامنے، حاضر ہوں تیرے سامنے، تیرا کوئی ہمسر وشریک نہیں، حاضر ہوں تیرے سامنے، بیشک ساری مدح وستائش تیرے لیے ہے، احسان سب تیرا ہے، تیرا کوئی ہمسر وشریک نہیں“۔

ان الفاظ کو دیکھئے اور سب کو ایک لباس میں برہنہ سر، تواضع اور یک جہتی کے ساتھ اپنے رب کے لیے انتہائی عقیدت اور سپردگی کے انداز کے ساتھ اکٹھا اور وارفتہ حال دیکھئے اور پروردگار عالم کی عبادت کے لیے تعمیر کیے جانے والے سب سے پہلے گھر کے گرد گھومتا ہوا اور قربان ہوتا ہوا دیکھئے تو حج کا وہ شاندار، دلنواز، پُر کیف وپُر سوز انداز سامنے آتا ہے، جس کی مثال نہ کہیں ملتی ہے اور نہ مل سکتی ہے۔

مسلمان جب حج سے واپس آتا ہے تو اپنے قلب میں ایسی کیفیت لے کر آتا ہے جو اس کی زندگی میں مقدس چراغ کے مانند ہوتی ہے جو تاحیات اس کے قلب کو روشن رکھتی ہے، اس سے اس کے دل میں اپنے پروردگار کے لیے وارفتگی، امت اسلامیہ کے تمام افراد سے اخوت ومحبت اور اپنی طرف سے ہمہ وقت بندگی کا احساس جاگزیں ہوجاتا ہے جو ایک مشعل کی طرح اس کے رجحانات وجذبات کو منور رکھتا ہے۔

حج سے ایک مسلمان بہت سے سبق سیکھتا ہے اور بہت سے آداب سے واقف ہوتا ہے اور بندگی کی اس تہذیب سے آشنا ہوتا ہے جو حج کے مقامات پر حاضر ہوئے بغیر اس کو نہیں حاصل ہوپاتی۔

اس لیے حج کا عمل مسلمان کی زندگی میں سنگ میل ثابت ہوتا ہے اور اس کو سنگ میل کی حیثیت بھی حاصل ہے، جو مسلمان حج سے نہ درست ہو اس کو سمجھا جاتا ہے کہ اب یہ کسی اور طریقہ سے درست نہ ہوسکے گا اور جو حج کو جانے لگتا ہے اس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اب یہاں سے اس میں تبدیلی آئے گی۔

حج ایک نعمت ہے، ایک لذت وکیفیت ہے، ایک درس وتربیت ہے، ایک انقلابی عمل ہے، اخلاق ودین کی ایک کان ہے، اس سے ایک مسلمان اپنی صلاحیت وفکرمندی کے مطابق اپنی زندگی کو سنوارنے کا سامان کھود کر لے آتا ہے؛ لیکن اگر اس کان پر آدمی نہ جائے یا جائے؛ لیکن اس کان سے اپنی ضرورت کا سامان نہ نکالے تو اس کی ناکامی کی ذمہ داری اسی کے سر ہوگی، حج پر یا مقاماتِ حج پر نہ ہوگی۔

☆☆☆☆☆

فکر معاصر

ابراہیمی سنت کو زندہ کرنے کی ضرورت

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام دنیا میں اس وقت آئے جب معصیت کا بازار ہر طرف گرم تھا، گھر سے لے کر باہر تک ساری دنیا صرف ایک کام میں مشغول تھی، اور وہ تھا بت سازی اور بت پرستی کا کاروبار، خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ آزر بت پرست ہونے کے ساتھ ہی ایک بڑے ماہر بت تراش اور اپنے زمانے کے فنکار بھی تھے، پورا ماحول اسی بت سازی اور بت پرستی کی لعنت میں گرفتار تھا، انسان کی معراج ہی یہ تھی کہ کم از کم اگر وہ بت ساز نہیں ہے تو بت پرست ضرور ہو، اس وبا نے تمام انسانوں کو بری طرح گھیر رکھا تھا، اور ہر شخص اپنے حقیقی ماحول سے دور بہت دور ایک ایسی خار دار وادی میں بھٹک رہا تھا جہاں بجز معدہ و مادہ کے کسی اور بات کا گذر نہ تھا، اور لوگ اس کے علاوہ کسی اور چیز سے آشنا بھی نہیں تھے۔

حرص وہوس سے جکڑے ہوئے اسی ماحول میں ابراہیم علیہ السلام نے آنکھ کھولی، انہوں نے اپنی حقیقت آشنا نگاہوں سے اس گھٹتے ہوئے انسان کو دیکھا جو اپنی ساری صلاحیتوں کو پتھر اور لکڑی پر صرف کر رہا تھا، انہوں نے ایک بے جان اور بے حس وحرکت بت کے سامنے لوگوں کو اپنی پیشانیاں ٹکاتے ہوئے دیکھا، انہوں نے اس محدود اور مقید ذہن کو دیکھا جو ایک تنگ دائرے کے ارد گرد گھوم رہا تھا، اور جس کا مطمح نظر صرف معدہ تھا، اور مادہ پرستی کی ایک گھناؤنی شکل جس کا مرکز توجہ والتفات تھی۔

یہ ساری باتیں انسان کے فطری وظیفہ کے بالکل خلاف تھیں اور دوسرے الفاظ میں انسانی فطرت سے جنگ کے مرادف تھیں، ابراہیم علیہ السلام نے اپنی خداداد صلاحیت اور اپنی فطری قوت سے ان تمام مادی طاقتوں کو چیلنج کیا، یا انہوں نے بت پرستی اور بت سازی کی مخالفت کی، انہوں نے حرص وہوس کی اندھی تقلید پر احتجاج کیا، اور انہوں نے اس غیر حقیقی ماحول کے خلاف اعلان جنگ کیا اور اپنے باپ آزر کو اس بے راہ روی سے باز رہنے کی فہمائش کی، اور قرآن مجید کی زبان میں ابراہیم علیہ السلام نے صاف صاف کہا:

"وَإِذْ قَالَ لأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَايَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئاً، يَاأَبَتِ إِنِّيْ قَدْ جَاءَ نِي مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطاً سَوِياً، يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ، إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عصِيّاً، يَا أَبَتِ إِنِّيْ أَخَافُ أَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيّاً" [مریم: ۴۲-۴۵] (جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے (جو کہ مشرک تھا) کہا کہ اے میرے باپ! تم ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ کچھ سنے اور نہ کچھ دیکھے اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے؟ اے میرے باپ! میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا، تو تم میرے کہنے پر چلو، تم کو سیدھا راستہ بتاؤں گا، اے میرے باپ! تم شیطان کی پرستش مت کرو، بیشک شیطان رحمٰن کی نافرمانی کرنے والا ہے، اے میرے باپ! میں اندیشہ کرتا ہوں کہ تم پر رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپڑے، پھر تم (عذاب) میں شیطان کے ساتھ ہو جاؤ)۔

ابراہیم علیہ السلام کی یہ صاف گوئی اور ان کا اعلان حق آزر کی بت ساز طبیعت کو چیلنج نہ کر سکا، اور وہ اس غیر حقیقی ماحول کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کی بات سننے اور ماننے پر کسی طرح تیار نہ ہوا، اور اس نے صاف صاف کہہ دیا:

"قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِيْ يَاإِبْرَاهِيْمُ، لَئِن لَّمْ تَنْتَهِ لأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيّاً" [سورۂ مریم: ۴۶] (باپ نے جواب دیا کہ تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو، اے ابراہیم! اگر تم باز نہ آئے تو میں ضرور تم کو پتھروں سے سنگسار کردوں گا اور ہمیشہ کے لیے مجھ سے برکنار رہو)۔

لیکن ابراہیم علیہ السلام ہر طرح کی دھمکی اور خطرے سے بے پروا اپنے کام میں مشغول رہے اور فطرت کے اصول کے سامنے انہوں نے کسی ایسے تصور کو ماننے یا اس کے قبول کرنے سے قطعاً انکار کر دیا جو انسان کو انسان ہی کے آگے نہیں بلکہ پتھروں اور بے حس وحرکت مجسموں کے سامنے جبین نیاز جھکانے پر آمادہ کرے، وہ اس مصنوعی اور بے جان ماحول میں ایک اجنبی تھے، لیکن ان کے ایمان کی طاقت نے اپنے زمانے کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لی اور پوری آبادی کے خلاف ان کی آواز اس وقت اٹھی جبکہ ہر طرف سے خطرات ان کو گھیرے ہوئے تھے، اپنے اور پرائے ان کے دشمن ہو چکے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام نے ہر خطرہ کو دعوت دی اور ہر مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوئے، آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں میں اپنی جان عزیز کو فنا کر دینے میں انہوں نے ذرا بھی تامل نہیں کیا، جس کا انجام یہ ہوا کہ مخالفین پسپا ہو گئے، دشمن شکست کھا گئے اور آگ کے دہکتے ہوئے شعلے گل وگلزار بن گئے، یہ ابراہیم علیہ السلام کے ایمان کی وہ لازوال اور غیر فانی طاقت تھی جس کے سامنے دنیا کی ہر بڑی طاقت شکست خوردہ تھی اور جس نے اپنے زمانے کے جابر اور صاحب سطوت بادشاہ کے سامنے اس شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کیا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں مفقود ہے۔

اس آزری ماحول کو جنم دینے اور اس غیر حقیقی معاشرہ کو برپا کرنے میں جس چیز کو سب سے زیادہ دخل تھا وہ اسباب ووسائل کے پیدا کرنے والے سے قطع نظر کر کے اسباب ووسائل پر مکمل اعتماد تھا، اسباب ہی معبود وکارساز سمجھے جانے لگے تھے اور وسائل ہی پر زندگی کی ساری عمارت قائم تھی، اللہ تعالیٰ نے اس دور کے انسانوں کو متنبہ کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے اسباب وعلل کی بے بسی کا راز افشا کرنا چاہا اور یہ بتایا کہ ان وسائل کے بغیر بھی انسان کس طرح بلند سے بلند مرتبہ پر پہونچ سکتا ہے اور وہ کس طرح بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی اور زندگی کے ہر ہر گوشے میں یہ پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ ہر موقع پر اس کا اظہار ہوتا ہے، خواہ وہ آتش نمرود ہو یا وادیٔ غیر ذی زرع کے تپتے ہوئے ریگستان، بے یار ومددگار بیوی کی بے تابی اور شدت انتظار ہو یا شیر خوار بچے کی پیاس کی بے چینی ہو، ظالم وجابر بادشاہوں کی نظر حرص ہو یا پوری قوم اور برادری کی شدت عداوت کا عالم ہو، آپ جدھر بھی نظر ڈالئے وسائل واسباب کا فقدان اور بے یاری وبے بسی، عجز وتہی دستی ہر جگہ نمایاں اور صاف نظر آئے گی، لیکن اس کے باوجود ہر موڑ پر کامیابی اور سخت سے سخت آزمائش میں ایک غیبی مدد اس طرح ساتھ ساتھ دکھائی دے گی کہ اسباب ووسائل کی اس دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

ابراہیم علیہ السلام صرف ایک ماحول یا ایک قوم اور معاشرہ کے باغی نہیں تھے بلکہ وہ اس زمانے کے باغی تھے جو اپنا حقیقی راستہ بدل کر وسائل کی راہ پر گامزن تھا اور اسی کو اپنی معراج اور حقیقی کامیابی کا راستہ سمجھ رہا تھا، انہوں نے آکر اعلان کیا کہ اے اہل زمانہ! تم نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ تمہاری خودی اور تمہارے مرتبہ کے کسی طرح شایان شان نہیں ہے، تم اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بت سازی وبت پرستی میں مشغول ہو، تم انسان ہو کر ان مجسموں کے سامنے جھکتے ہو جو تم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہونچا سکتے، بلکہ وہ ہر وقت تمہارے ہی محتاج رہتے ہیں، ان پر ایک مکھی بیٹھ جائے تو اس کو اڑانے کی بھی طاقت جس معبود کے اندر نہ ہو وہ بلاشبہ باطل وناحق ہے، اور اس سے لو لگانا، اس کے سامنے جبین نیاز جھکانا تمہاری سخت توہین ہے، اور تمہاری جبین امتیاز پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہزاروں سال پہلے جن خود ساختہ معبودوں اور خانہ ساز اصولوں کو توڑا تھا، آج دنیا پھر انہیں معبودوں اور انہیں اصولوں کی پیروی کر رہی ہے، تاریخ نے گویا اپنے آپ کو دہرایا، اور آزر کی صنعت کو آج پھر فروغ حاصل ہوا ہے، وسائل واسباب کے سامنے آج عجز وعبادت کا سر خم ہو رہا ہے، کارساز حقیقی سے بے تعلق اور فنا ہو جانے والے اسباب پر کامل توکل اور بھروسہ، آج کی دنیا کا اصول بن چکا ہے۔

یہ آزری فتنہ جب بھی دنیا میں فروغ پائے گا اور وہ محدود وتنگ ماحول جہاں بھی قائم ہوگا وہی لعنتیں اس کے ساتھ آئیں گی، معیار بدل جائے گا، ذہنی توازن متغیر ہو جائے گا، گناہوں، لذتوں اور شہوات نفس کو اخلاقی قدروں کا درجہ دے دیا جائے گا، ہر بے اصولی اور فطرت سے بغاوت کو فن اور صنعت کا لباس پہنا دیا جائے گا، اور انسان نہ صرف انسان کے آگے جھکنے لگے گا، بلکہ وہ گناہوں کی عبادت، نفس کی پرستش، رذالت وکمینگی کو فروغ دینے کے لیے اپنے سارے امکانات کو صرف کرنے کی پیہم کوشش میں لگ جائے گا، اور انسانیت دم توڑتی ہوئی نظر آئے گی۔

فتنہ آزری آج سے ہزاروں سال پہلے پیدا ہوا تھا؛ لیکن آج پھر وہ تازہ دم ہے اور ساری دنیا کو اپنے تیز رو سیلاب کی زد میں لے چکا ہے، اگر پہلے ایک آزر تھا تو آج ہزاروں لاکھوں آزر پیدا ہو چکے ہیں، اگر اس آزر نے سنگ سار کرنے کی دھمکی دی تھی تو آج کے آزر لاکھوں ابراہیموں کو گولی کا نشانہ بنا چکے ہیں اور دار کے تختوں پر لٹکا چکے ہیں، اور آزر کا طوفان اتنا بلا خیز نہیں تھا جتنا اس کے متبعین اور آج کے آزروں کا ہے۔

پورے ہجری سال میں سب سے زیادہ ابراہیمی یادگاروں کا جو زمانہ ہے وہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، جس میں ابراہیم علیہ السلام کی متعدد یادگاروں اور مختلف آزمائشوں کو ہم یاد کرتے ہیں اور ان کی

اتباع میں ہم بھی خدا کے حضور اپنی معمولی قربانی پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں ، بلاشبہ ہماری قربانیاں، صفاومروہ کے درمیان ہماری سعی اوراس گھر کا طواف جس کوابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا یہ سب کچھ بہت ضروری اور ان کو انجام دینے والا خوش قسمت اور باعث صد مبارکباد ہے اوران سے انکار کرنیوالا قابل عتاب وملامت بلکہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

لیکن اس اعتراف کے باوجود یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ محض رسمی طور پر ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی پیروی کرلینا اوران کی یادگار میں شریک ہولینا اور سال میں عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک جانور کی قربانی دیدینا کافی نہیں، اورنہ اس سے اس طوفان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے جس کا مقابلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانے میں کیا۔

اس وقت دنیا مادیت کے سامنے اسی طرح سربسجود اور اسباب ووسائل کی پرستش میں اسی طرح مشغول ومنہمک ہے جس طرح ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تھی ، بلکہ آج اس مادیت کا دھارا پہلے سے زیادہ تیز ہے، پہلے مٹی اور پتھر کے بت پوجے جاتے تھے؛لیکن آج سونے چاندی کے بت، تہذیب وتمدن کے بت اور قومیت ووطنیت کے مجسموں کی پرستش میں دنیا پوری طرح ڈوبی ہوئی ہے اور مختلف ناموں سے نفس کی پرستش میں لوگ مصروف ہیں، کبھی فن اور آرٹ کے نام سے نفس کی پوجا ہورہی ہے تو کبھی خدمت اور ترقی کے نام سے بت پوجے جارہے ہیں، اور کہیں علم وادب کا سائن بورڈ لگا کر مادیت کے سیلاب کو آگے بڑھایا جارہا ہے۔

آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ہر چیز کی شکل بدل گئی ہے اور ہر پہلو سے آزری فلسفوں کی خدمت ہورہی ہے، یہ وہ وقت ہے جبکہ ابراہیم علیہ السلام کے پیروؤں کو بت شکنی کے لیے کمربستہ ہونا چاہیے، آج ابراہیم جیسا ایمان ،ابراہیم کی سی جرأت وہمت اور ابراہیم جیسا اخلاص چاہیے، جو مادیت کے فلسفوں میں جکڑی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کا مداوا کرسکے اوراس کو بچا سکے۔

آج اسی بت شکن، بہادر اور مردمومن، جری اور مخلص ابراہیم کی ضرورت ہے جس نے اپنے نفس ایمانی سے آزر کے جادو کو توڑا ،اور اپنے اخلاص وعمل کے جذبہ سے آزر کے بت کدہ کو ٹھنڈا کیا،اس بت کدہ میں آج پھر بہت سے بت جمع ہوگئے ہیں اوران کو توڑنے کے لیے ایک ابراہیم کی ضرورت ہے ؛لیکن بجز ابراہیم علیہ السلام کے پیروؤں کے اورکون ہوسکتا ہے جواس مہم کوانجام دے اور ابراہیمی سنت کو پھر سے زندہ کرکے انسانیت کا خراج حاصل کرے۔

☆☆☆☆☆

توجہ کامل، شوقِ طلب اور حرصِ علم

علامہ سید سلیمان ندویؒ

علمی زر وجواہر جن خزانوں میں سربمہر محفوظ ہیں ان کا نام کتاب ہے، گزشتہ علماء جن خزانوں کے مالک تھے ان میں سے اب بھی اکثر مع اضافہ کے موجود ہیں، دوردراز مقامات جو پہلے پیادہ پا برسوں میں طے ہوتے تھے، اب ہفتوں میں طے ہوتے ہیں ، چھاپہ کی ایجاد نے کتابوں کو عام کردیا، مدارس شہر بشہر قائم ہیں،لیکن باوجود ان تمام آسائشوں کے، ان تمام راحتوں کے، اس فضل وکمال کے جوہر اب نظر نہیں آتے ،جس نے دور ماضی میں ایک ایک ذرہ کو آفتاب بنادیا تھا۔

حقیت یہ ہے کہ وہ خزانے گو ہمارے پاس اب تک محفوظ ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ سفر کی گذشتہ زحمتیں زائل ہوگئی ہیں اور پریس نے کتابیں عام کردی ہیں؛لیکن وہ توجہ کامل، وہ شوق طلب، وہ حرص علم اب مفقود ہے جو علماء کو رات رات بھر لطف وخواب سے محروم رکھتا تھا، جس سے لذت علم لذت طعام سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی تھی، جس کی محویت خود فراموشی پیدا کردیتی تھی، جس کا شوق نظارہ مصائب زمانہ اور سکرات موت کو بھی بھلا دیتا تھا، موجودہ تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ طلباء نصاب کی چند کتابوں کے سوا سلف کے تمام علمی کارناموں سے بے خبر، ان کے علمی نتائج وجد جہد سے ناآشنا ہوتے ہیں ،ہم اپنا بڑا کمال یہ سمجھتے ہیں کہ مندرجہ نصاب کتابوں کا ایک ایک حرف مع اعتراضات وحواشی کے نوک زبان ہو، چند کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد ہم اپنے کو فارغ التحصیل کہتے ہیں، جس کے معنے گویا یہ ہیں کہ ہم ہر قسم کے علوم سے فارغ ہوگئے ہیں، ہمارے معاملات میں ایک ذرہ کا بھی اضافہ نہیں ہوسکتا، حالانکہ کتب نصاب صرف استعداد کی ذمہ دار ہیں، ورنہ اصلی علوم ان دفتروں میں محفوظ ہیں جو قدیم خاندانوں کے صندوقوں اور کتب خانوں کی الماریوں میں مدفون ہیں، یہی وجوہ ہیں کہ طالب علمانہ زندگی کے بعد ہم پھر کسی کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگاتے اوراس وقت سے لے کر تادم مرگ ہمارے دائرہ معلومات میں ایک نقطہ کا بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ ☆☆☆

نشانِ راہ

حالات کا نیا رُخ اور علماء کی ذمہ داری

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

اس وقت دنیا جن حالات سے دوچار ہے اور ہمارا ملک جس رخ پر جارہا ہے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس وقت اصل ذمہ داری ہمارے علماء پر ہے۔ اسلامی مدارس میں پڑھنے والے بچے ان شاء اللہ کل عالم ہوں گے اور چراغ کی شکل میں مختلف علاقوں میں روشن ہوں گے اور ان کی روشنی سے روشنی پھیلے گی، لیکن یاد رکھئے کہ یہ چراغ بغیر تیل اور بتی کے روشن نہیں ہوسکتا، اس میں تیل کی بھی ضرورت ہے اور بتی کی بھی اور پھر اس کو روشن کرنے کی بھی ضرورت ہے، اگر آپ نے تیل اور بتی کا انتظام کرلیا اور آپ کا چراغ تیار ہوگیا؛ لیکن اگر آپ نے اس کی لو کو روشن نہ کیا اور کسی جلتے ہوئے چراغ کی روشنی کے قریب کرکے اپنے چراغ کو جھکا کر اس کی لو کی روشنی سے اپنے چراغ کی لو کو روشن نہ کیا تو یاد رکھئے کہ یہ چراغ کبھی بھی روشن نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے مرحلہ میں ہم ان ظاہری شکلوں سے اپنے آپ کو آراستہ کریں جو چراغ کی شکل میں ہیں یا تیل اور بتی کی شکل میں ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ ارادہ بھی کریں کہ ان شاء اللہ ہم اپنے چراغ کی اس لو کو کہیں جا کر اور اپنے آپ کو پوری تواضع کے ساتھ جھکا کر کسی جلتی ہوئی لو کے قریب لے جا کر روشن کریں گے، تاکہ پھر قربانیوں کے ساتھ اپنے اپنے علاقوں میں تیل اور بتی جلا کر اور اپنے آپ کو کھپا کر ہم دنیا میں روشنی کا انتظام کرسکیں۔

آپؐ کا درد وفکر

اللہ تبارک وتعالیٰ کے دین کی خاطر اپنے آپ کو کھپا دینے کا یہ راستہ ہمیں سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ خود قرآن مجید گواہی دیتا ہے:

"لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَـٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً" [الکہف: ۶] (اگر انھوں نے یہ بات نہ مانی تو لگتا ہے کہ آپ ان کے پیچھے اپنی جان ہلکان کردیں گے)۔

واقعہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امت کے ایک ایک فرد کے لیے یہ دردوفکر ہے۔ قرآن مجید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وہ تصویر پیش کی گئی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں ہمیں نظر آتی ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لیے اپنے دردوفکر کی یہ آخری مثال دی کہ:

"مَثَلِي وَمَثَلُكُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَوْقَدَ نَاراً فَجَعَلَ الْجَنَادِبُ وَالْفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيهَا وَهُوَ يَذُبُّهُنَّ عَنْهَا وَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَفَلَّتُونَ مِنْ يَدِي." [صحیح مسلم: ۶۰۹۸]

(میری اور تمہاری مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی اور کیڑے مکوڑے اور پتنگے اس میں گرنے لگے، جس طرح وہ شخص انہیں اس میں گرنے سے روکتا ہے، ٹھیک اسی طرح میں تمہیں پکڑ کر (دوزخ کی) آگ سے پیچھے ہٹا رہا ہوں مگر تم میرے ہاتھوں سے پھسلے جاتے ہو)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال کے ذریعہ سے امت کو ایک سبق دیا اور یہ مثال ایک واقعہ کے طور پر بیان نہیں کی بلکہ اس کے ذریعہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ایک پیغام دیا اور گویا یہ بتادیا کہ اب آگے ذمہ داری تمہاری ہے۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے، اس وقت مسلمانوں میں جو خرابیاں ہیں وہ ایک طرف لیکن جو مسلمان نہیں ہیں اور انہوں نے اپنے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا، کیا ہم ان کو آگ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ رہے ہیں؟ مگر سوچنے کا مقام ہے کہ ہم نے ان کی خاطر اپنی جانوں کو کتنا کھپایا اور ان کے لیے ہمارے اندر کیا درد وکڑھن پیدا ہوئی؟ اگر کوئی انسان آگ کے گڈھے میں جارہا ہے اور دوسرا انسان اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہا ہے تو اگر اس کے دل میں درد ہے اور میں کہتا ہوں کہ اس کے اندر کسی بھی حیثیت سے انسانیت ہے تو وہ یہ منظر برداشت نہیں کرسکتا بلکہ وہ اس شخص کے قریب جائے گا اور اس کی کمر پکڑ کر اس کو روکے گا اور کہے گا کہ کیا آپ کو نظر نہیں آتا، آپ کے سامنے آگ بھڑک رہی ہے، اگر آپ نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو آپ اس آگ میں جل جائیں گے۔

قرآن مجید میں جابجا انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے واقعات کا ذکر ہے جن میں انبیاء علیہم السلام کے اسی دردوفکر کو بیان کیا گیا ہے یعنی پوری پوری عمر ان کا اپنی اپنی قوموں کو اللہ کی طرف بلانا اور قوموں کا انہیں تکلیفیں دینا، ان کے سروں پر آرے چلانا، ان کو ہلاک کرنا اور شہید کرنا اور ان کے لیے ہر طرح کی سازشیں کرنا۔ اس سلسلہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازشیں

کی گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکالا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا گھر بار چھوڑا اور بیت اللہ کو چھوڑتے وقت آپ کے دل پر جو چوٹ تھی وہ آپ کی زبان مبارک سے اس طرح ظاہر ہوئی کہ:

"مَا أَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَأَحَبَّكِ إِلَيَّ وَلَوْلَا أَنَّ قَوْمِي أَخْرَجُونِي مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ." [سنن الترمذی: ۳۹۲۵] (تو کتنا پاکیزہ شہر ہے اور مجھے کتنا عزیز ہے، اگر میری قوم کے لوگ مجھے تجھ سے دور نہ کرتے تو میں تیرے سوا کہیں نہ رہتا)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح کی قربانیاں دیں اور اس لیے دیں تاکہ یہ امت صحیح راستے پر آجائے۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر تمام دشمن سامنے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جنبش کافی تھی، دس ہزار کا مسلح لشکر تھا، اگر آپ چاہتے تو سب باغیوں کے سر قلم کردیے جاتے، لیکن آپ کو تو ان کا ایمان اور ان کی نجات عزیز تھی کہ کسی طرح سب صحیح راستے پر آجائیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو معاف کیا اور اس معافی کا اثر یہ ہوا کہ ایک لمحہ میں ہزار ہا ہزار لوگ اسلام میں داخل ہوگئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امت کے لیے یہ وہ درد وفکر اور یہ وہ تڑپ اور کڑھن ہے جو ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت میں حاصل ہونی چاہیے۔ اگر یہ چیز ہمارے اندر پیدا ہوجائے تو میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ ہماری یہ کڑھن اور تڑپ اپنے لیے ہزار راستے بنالے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ" [العنکبوت: ۶۹] (اور جو بھی ہمارے لیے جان کھپائیں گے تو ہم ضرور ان کے لیے اپنے راستے کھول دیں گے اور یقیناً اللہ بہتر کام کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے)۔

صلاحیت کو استعمال کرنے کی ضرورت

آج بظاہر ہمیں راستے بند نظر آتے ہیں، ہمارے سامنے طرح طرح کی باتیں ہوتی ہیں، یہاں تک کہ بعض مرتبہ لوگ مایوسی کی باتیں بھی کرنے لگتے ہیں کہ اب اس ملک میں مسلمانوں کا کیا ہوگا؟ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اللہ نے آپ کے لیے راستے کھولے ہیں، اللہ نے آپ کو دین کا علم دیا ہے، اللہ نے آپ کو شریعت کا حامل بنایا ہے اور دین کی سمجھ دی ہے، اللہ نے آپ کو انذار قوم کی صلاحیت سے نوازا ہے، اللہ نے آپ کو وہ سب کچھ دیا ہے جو حالات کو بدلنے کے لیے کافی ہے۔ آپ اس کو استعمال کیجیے، آپ آگے بڑھیے، اللہ آپ کے لیے راستے کھولے گا اور ایسے راستے کھولے گا کہ اس کا تصور نہیں ہوسکتا۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ایسے پرفتن حالات میں بجائے اس کے کہ ہمارے نوجوانوں کے اندر انسانیت کا درد پیدا ہو، اپنی راتوں کو برباد کیا جائے، اپنی نگاہوں کو برباد کیا جائے، اپنے دل ودماغ کو گندگیوں سے گویا پلید بنالیا جائے اور اپنی زندگیوں کو غلط رخ پر لے جایا جائے، یہاں تک کہ ہمارے مدارس کے طلباء اور مدارس سے فارغ ہونے والے بھی یہ نہ سوچیں کہ ہم کس رخ کی طرف جارہے ہیں اور ہم پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

آپ یاد رکھئے! زمانہ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا، زمانہ آپ کا منتظر ہے، زمانہ یہ چاہتا ہے کہ آپ نے دین کا علم حاصل کیا ہے تو آپ میدان عمل میں بھی آیئے، آپ علم کی روشنی پھیلایئے، آپ اس کی خاطر قربانی کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کیجیے اور اپنے اندر امت کا درد وفکر پیدا کیجیے۔ اگر آپ نے اپنے طرز زندگی کو بدلا اور یہ طے کیا کہ آج زمانہ جس رخ کی طرف جارہا ہے اور ہمارے نوجوان جس رخ کی طرف جا رہے ہیں، ہمیں ان کو صحیح رخ پر لانا ہے اور اس کے لیے ہر ممکن محنت کرنی ہے، تو آپ یقیناً دیکھیں گے کہ حالات کس طرح بدلتے ہیں۔ میں آپ سے کیا سوال کروں، آپ خود غور کیجیے اور اگر بتاسکتے ہوں تو بتایئے کہ ہمارے کتنے بھائی ہیں جن کے اندر یہ درد وفکر پائی جاتی ہے۔

چھلکوں میں مت الجھئے

آج یہ امت چھلکوں میں الجھ کر رہ گئی ہے، یہاں تک کہ ہمارے علماء بھی چھلکوں میں الجھ کر رہے گئے ہیں اور ہمارے طلبہ کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمارے مدرسین اس کی طرف زیادہ فکر کر پاتے ہیں۔ یاد رکھئے! اگر آپ انہی چھلکوں میں الجھے رہے تو مغز تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ جس طرح نارنگی کا کڑوا چھلکا آپ کے منھ میں ہمیشہ کڑواہٹ گھولتا رہے گا، آپ ہمیشہ اس کڑوے پن اور تلخی کا شکار رہیں گے اور آپ کو کبھی مٹھاس میسر نہیں ہوگی، جب تک کہ آپ اس چھلکے کو اتار کر مغز تک نہ پہنچ جائیں۔ اسی طرح دین کے معاملہ میں بھی آپ کو مغز تک پہنچنا پڑے گا اور اس کے لیے آپ کو دل ودماغ کو تیار کرنا پڑے گا، مگر یہ واقعہ ہے کہ آج ہم چھلکوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور مغز تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔

امام مالکؒ کے شاگرد امام یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ مشہور ہے، وہ امام مالکؒ کے پاس مدینہ میں پڑھ رہے تھے کہ اسی دوران شہر میں ہاتھی آگیا، مدینہ میں ہاتھی ایک عجوبہ تھا، سب طلبہ ہاتھی دیکھنے

کے لیے چلے گئے، لیکن امام یحییٰ بیٹھے رہے۔ امام مالک نے پوچھا کہ سب لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے مگر تم کیوں بیٹھے رہے؟ تو انہوں نے عجیب بات کہی، انہوں نے کہا کہ میں آپ کے پاس علم حاصل کرنے آیا ہوں، ہاتھی دیکھنے کے لیے نہیں آیا، میں تو یہاں اس لیے آیا ہوں تاکہ آپ سے حدیثیں پڑھوں اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اقوال سنوں۔ امام مالکؒ نے فرمایا: اللہ تمہارے علم میں برکت دے گا پھر دنیا نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے امام مالکؒ کے اخلاص کے نتیجہ میں ان کی کتاب ''مؤطا'' کو کیسی قبولیت بخشی؛ لیکن ان کا مسلک جس شخصیت کے ذریعہ دنیا میں سب سے زیادہ پھیلا وہ امام یحییٰ ہیں، وہ مغرب کے رہنے والے تھے، جب وہ وہاں گئے تو ان کے ذریعہ سے امام مالکؒ کا مسلک پھیلا اور امام مالک کی ''مؤطا'' انہی کے ذریعہ سے عام ہوئی۔

آج ہمارے طلبہ کا حال تو یہ ہے کہ ان کے لیے ہاتھی تو بڑی چیز ہے، اگر کوئی چیونٹی آ گئی، یا کوئی کیڑا آ گیا، یا وہ لوگ آ گئے جن کا میں اس مبارک محفل میں کیا نام لوں، خطرہ ہے کہ کہیں اس نورانی مجلس میں ظلمت نظر نہ آنے لگے، واقعہ یہ ہے کہ اگر طلبہ کو کسی کے متعلق پتہ چل جائے تو وہ اپنی یکسوئی باقی نہیں رکھ پاتے ہیں۔ یاد رکھئے! اگر آپ خدانخواستہ اسی طرح چھلکوں میں الجھتے رہے، اگر آپ نے اپنے دل ودماغ کو تیار نہ کیا اور اگر آپ نے حصولِ علم کی خاطر یکسوئی حاصل نہ کی تو آپ کو کچھ نہیں مل سکتا۔

زمانہ آپ کا منتظر ہے

میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آپ مدرسہ سے ایک عزم لے کر جائیے، زمانہ آپ کا منتظر ہے، قومیں آپ کی منتظر ہیں، انسانیت آپ کی منتظر ہے اور دل ودماغ آپ کے منتظر ہیں کہ مدارس میں پڑھنے والے ہماری ایک امانت ہیں، یہ مدارس سے فارغ ہوکر نکلیں گے تو ہمیں ان سے روشنی ملے گی، ہمیں ان سے ایمان ملے گا، ہمیں ان سے انسانیت ملے گی، ہمیں ان سے صحیح راستہ ملے گا اور شریعت کا جوہر ملے گا۔

میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آج جو بگاڑ ہمیں نظر آ رہا ہے، یہ بگاڑ ہماری وجہ سے ہے۔ اگر ہم امت کو صحیح رخ دے دیں اور پوری قربانیوں کے ساتھ ہم میدانِ عمل میں آ جائیں تو اس میں شبہ نہیں کہ خود آپ کی آنکھیں یہ دیکھیں گی کہ بعض اوقات صرف ایک اللہ کے بندہ کے صحیح قربانی کے ساتھ، اخلاص اور صحیح جذبہ کے ساتھ کھڑے ہونے کے نتیجہ میں قوموں کی تقدیر بدل جاتی ہے جس کی تاریخ میں دسیوں مثالیں موجود ہیں۔ آپ کے سامنے امام سرہندیؒ کی مثال ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مثال ہے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی مثال ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے ان علماء کی مثال ہے جنہوں نے قربانیاں دے کر بڑے بڑے مدارس قائم کیے، جس کے نتیجہ میں ۱۹۴۷ء کے بعد کا خطرہ ہمارے سامنے سے ہٹ گیا اور چھٹ گیا اور آج الحمدللہ پورے ملک میں مدارس قائم ہیں اور اس ملک میں مسلمان عزت کے ساتھ باقی ہیں، بلاشبہ یہ انہی علماء کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔

محنت کی غرض وغایت

ہم یہ طے کریں کہ ہمیں دین کے لیے محنت کرنی ہے، ہمیں دین کے لیے قربانی دینی ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے اندر اخلاص پیدا کرنا ہے۔ یہ مدارس اس لیے نہیں ہیں کہ ہم اس چیز میں الجھ کر رہ جائیں کہ یہ ہمارا مدرسہ ہے، یہ ہمارا ادارہ ہے، یہ ہماری تحریک ہے اور یہ ہماری تنظیم ہے۔ ہمارا کچھ نہیں ہے، سب کچھ اللہ کا ہے۔ یہ مدرسے بھی اللہ کے ہیں، یہ ادارے اور تحریکات بھی اللہ کے لیے ہیں۔ آپ ان کو مقصود ہرگز نہ بنائیں، مقصود اللہ کی ذات ہے، مقصود اللہ کا دین ہے، مقصود اللہ کی شریعت اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کا وہ ملفوظ مجھے یاد آتا ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ پرانوں کے جوڑ میں لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا تھا کہ:

''جب تم لوگ گشت کو جاتے ہو تو اس وقت تمہارے ذہن میں کیا نیت ہوتی ہے؟''

ایک صاحب نے عرض کیا:

''ہمیں خیال ہوتا ہے کہ لوگ تبلیغی جماعت سے جڑ جائیں گے۔''

حضرت نے فرمایا:

''اگر تمہارے اندر یہ خیال ہوتا ہے تو یاد رکھو! تم مخلص نہیں ہو۔ تمہارے اندر یہ خیال ہونا چاہیے کہ لوگ اللہ سے جڑ جائیں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑ جائیں اور اللہ کے دین سے جڑ جائیں''۔

پھر فرمایا کہ:

''دیکھو! تمہارے اندر یہ جو بات پیدا ہو رہی ہے اس کو اپنے ذہن ودماغ سے نکال دو، جماعت پنا پیدا کرو، امت پنا پیدا کرو اور جزئیات میں مت پڑو کہ یہ فلاں کا ادارہ ہے اور یہ فلاں کی تحریک ہے''۔

بلاشبہ یہ بڑی بنیادی بات ہے، ہمیں اصلاً دین کا محافظ بننا ہے، نہ کہ کسی اور چیز کا۔ ہمیں اپنے دینی مدارس اسی لیے عزیز ہیں کہ یہ اس ملک میں اسلام کے قلعے ہیں اور دین کی حفاظت کا ذریعہ ہیں، اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو اسلام نہ ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

علم کے فوائد

اگر ہم اپنی نیتوں کو درست کرکے اور صحیح

جذبہ کے ساتھ میدان عمل میں آئیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ" [الزمر: ۹] (پوچھئے کہ کیا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے برابر ہوسکتے ہیں، یقیناً نصیحت تو عقل مند ہی حاصل کرتے ہیں)۔

ظاہر ہے ایک آدمی جانتا ہے کہ سانپ کاٹتا ہے تو وہ اس سے محتاط رہے گا اور ایک آدمی کچھ نہیں جانتا تو وہ سانپ سے کھیلے گا۔ اسی طرح ایک چھوٹا بچہ یہ نہیں جانتا کہ آگ کا انگارہ اس کا ہاتھ جلادے گا تو وہ اس کو پکڑے گا، اس لیے کہ اس کو اس کی چمک دمک نظر آرہی ہے اور جب اس کے ماں باپ یا کوئی بڑا اسے روکے گا تو وہ چیخے گا اور چلائے گا اور یہی سوچے گا کہ میں ایک خوبصورت چیز کو پکڑنا چاہتا ہوں مگر یہ مجھے پکڑنے نہیں دیتے۔ بس یہی جاننے اور نہ جاننے کا فرق ہے۔ اگر ہم بڑے بھی ہوجائیں لیکن ہمیں اپنے نقصانات کا خیال نہ رہے، اگر ہمیں یہی احساس نہ ہو کہ ہم کس رخ کی طرف جارہے ہیں، اگر ہمیں یہی خیال نہ رہے کہ ہم اپنے آپ کو برباد کررہے ہیں تو اس سے بڑھ کر نادانی کیا ہوسکتی ہے؟ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ہم نے جس کتاب مقدس "قرآن مجید" کا علم حاصل کیا ہے وہ "الفارِق" ہے، ہم نے جس "شریعت" کا علم حاصل کیا ہے وہ "الفارق" ہے یعنی اچھے اور برے کی تمیز کرنے والا اور حق وباطل کے درمیان تفریق کرنے والا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو بھی "الفاروق" اسی لیے کہا گیا کہ وہ حق وباطل کا ایک امتیاز اور نشان ہیں۔

شانِ امتیازی کے حصول کا طریقہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں جو امتیازی شان دی ہے، یہ ہمارے اندر پوری طرح تب ہی پیدا ہوگی جب ہمارے اندر تقویٰ اور احتیاط کا مزاج ہو، جب ہمارے اندر اللہ کا ڈر پیدا ہو اور ہمیں یہ خیال ہو کہ ہمارا کوئی عمل اللہ کو ناراض کرنے والا نہ ہو۔ یہ وہ شان امتیازی ہے جس کا ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَاناً" [الأنفال: ۲۹] (اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا لحاظ رکھو گے تو وہ تمہیں ایک امتیاز عطا فرمائے گا)۔

اگر مسلمانوں کی یہ شان ہوجائے تو یقیناً اللہ تبارک وتعالیٰ انھیں ایک امتیاز عطا فرمائے گا، لیکن اس موقع پر میں خاص طور سے حضراتِ علماء سے کہتا ہوں کہ ان کے اوپر بڑی ذمہ داری ہے، اگر وہ صحیح اخلاق کے ساتھ، اچھے کردار کے ساتھ، اللہ کے خوف اور اس کی خشیت کے ساتھ اور اللہ کی رضا کو سامنے رکھ کر ایک قدم آگے بڑھائیں گے تو اللہ دو قدم بڑھائے گا، اگر وہ چلیں گے تو اللہ دوڑ کر آئے گا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ آپ کے اقدامات اور فیصلوں سے زمانہ کس طرح بدلتا ہے۔

ہندوستانی مسلمان ایک فیصلہ کن دوراہے پر

میں نے کئی جگہ یہ بات کہی کہ آج ہمارے فیصلوں پر اللہ کا فیصلہ منحصر ہے کہ ہم کون سا رخ اختیار کرتے ہیں؛ اپنی تباہی کا اور اس کے نتیجہ میں اس ملک کی تباہی کا؟ یا وہ رخ اختیار کرتے ہیں جو اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے یعنی محبت وانسانیت کا، صحیح دعوت کا، صحیح مزاج کا، اسلام کی ترجمانی کا اور اسلام کو اپنی زندگی سے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا۔ یقیناً ہمارا یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ کے فیصلے کو بدلنے والا ہے، اللہ کا فیصلہ ہوگا کہ اس ملک میں اسلام رہے گا، دین رہے گا، شریعت رہے گی اور اسلام کے ماننے والے رہیں گے۔ ہمارے بڑوں نے شروع میں قربانیاں دیں جن میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کو امتیاز حاصل ہے، یہ انہی کی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں آج تک مسلمانوں کی گاڑی چل رہی ہے۔ آج فیصلہ ہمیں کرنا ہے، اگر ہم نے بھی قربانی دینے کی ٹھان لی تو پوری دنیا کی طاقتیں بھی اس ملک سے اسلام کو ختم نہیں کرسکتیں۔ یہی اللہ کا فیصلہ ہے، ہمارے شہیدوں کے خون کا رنگ ہے اور ہمارے بڑوں کے آنسوؤں کی نمی الحمدللہ آج بھی ہماری زمین میں موجود ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس راستے پر اپنے آپ کو ڈالیں اور یہ طے کریں کہ ان شاء اللہ ہم اس دین کے حامل بنیں گے اور اس کو گھر گھر پہنچائیں گے۔ آج ارتداد کے واقعات کی خبر لینا ہمارے علماء اور ہمارے اصحابِ فکر کی ذمہ داری ہے، ہم طے کریں کہ ہمیں ان گھروں تک دین پہنچانا ہے اور ان کے اندر ایمان پر اعتماد بحال کرنا ہے۔ آپ ان کے لیے سینٹر بنائیے، اسلامک اسکول بنائیے اور ایک ایک مسجد میں مکتب کا نظام قائم کیجیے تاکہ مسلمانوں کا کوئی گھر ایمان کی دولت سے محروم نہ رہے۔ ہر مسلمان بچہ اسکول کی تعلیم حاصل کرے یا کالج میں جائے، لیکن یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ پہلے اپنے عقیدہ کو درست کرلے۔ یاد رکھئے! یہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور اگر ہم نے یہ نہ کیا تو ہماری نئی نسل ہاتھ سے نکل جائے گی۔

ترتیب وپیشکش: محمد ارمغان بدایونی ندوی

☆☆☆☆☆

راہِ عمل

وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسانیت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء جب بھی کسی قوم میں آئے، تو عام طور پر ان کا سابقہ دو طبقوں سے پیش آیا، ایک "ملأ قوم"، یعنی قوم کے سربرآوردہ لوگ، جن کو باعزت اور بلند مرتبت سمجھا جاتا، دوسرے وہ لوگ جن کو قرآن نے "ارا ذل قوم" یا "مستضعفین" سے تعبیر کیا ہے، یعنی قوم کے معمولی اور کمزور لوگ، جن کو سماج میں بے وزن اور کم حیثیت خیال کیا جاتا ہے، ہر نبی کی دعوت اپنی قوم میں ایک اجنبی دعوت کی حیثیت سے اُبھرتی تھی، قوم کے سربرآوردہ لوگ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوجاتے تھے؛ البتہ ان میں جو لوگ حقیت پسند اور نیک خو ہوتے تھے، وہ اپنی بڑائی کو قربان کر نبی کی دعوت پر لبیک کہتے تھے؛ لیکن ابتداءً ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ معمولی سمجھے جاتے ان کو دعوتِ حق قبول کرنے میں کوئی عار نہ ہوتی، وہ پہل کرتے اور پھر ظلم و جور کی بھٹی میں تپائے بھی جاتے، غالباً یہ بھی نظام غیبی کے تحت ہوتا؛ کہ چوں کہ وہ پہلے سے مظلوم و ستم رسیدہ ہوتے؛ اس لیے ان کے لیے ظلم و زیادتی اور تحقیر و تذلیل کا رویہ کسی درجہ میں قابل تحمل ہوتا۔

دعوت حق کو قبول کرنے میں سردارانِ قوم ہی اصل میں رکاوٹ بنتے ہیں، اہلِ مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر مخالفت کی، اس لیے نظامِ غیبی کے تحت غزوۂ بدر میں تمام سردارانِ مکہ جمع کر دیے گئے، اور وہ سب بدر میں ہلاک ہوئے، اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے سامنے ڈال دیے ہیں، بدر کے بعد اہلِ مکہ کے دو ہی قابلِ ذکر سردار باقی رہ گئے، ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن اُمیہ، اور ان دونوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، مدینہ میں جو اسلام کی اشاعت آسانی کے ساتھ اور تیز رفتاری سے ہوئی، تو اس کی ایک وجہ وہی تھی، جس کی طرف حضرت عائشہؓ نے اشارہ فرمایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اوس و خزرج کی خانہ جنگی میں عبداللہ بن ابی کے علاوہ صفِ اوّل کے تمام قائدین لقمۂ اجل بن چکے تھے؛ اس لیے یہاں اسلام کے خلاف مزاحمت کرنے والی کوئی منظم طاقت موجود نہیں تھی، عبداللہ بن ابی نے اپنے اندرونی نفاق کے ذریعہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی؛ لیکن انصارِ مدینہ پر نشۂ ایمانی چڑھ چکا تھا کہ وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، گویا خدا کے غیبی نظام کے تحت بعثت محمدیؐ سے پہلے ہی سرداران مدینہ رخصت ہو چکے تھے اور مدینہ کی سرزمین اسلام کے لیے نرم و ہموار ہو چکی تھی۔

یہی صورتِ حال مختلف انبیاء کرام کے ساتھ پیش آئی ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا تو یہی طبقہ ان کی دعوت پر ایمان لایا، جو لوگ ان کے معاند تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لائیں؛ حالاں کہ نیچ لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں؟ قَالُوا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ [شعراء:۱۱۱] شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے "أرذلون" کا ترجمہ "کمینہ" سے کیا ہے، اس تعبیر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ اس طبقہ کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، قرآن نے ایک اور مقام پر قومِ نوح کی اس تمسخر آمیز گفتگو کا ذکر کیا ہے کہ سرداران قوم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو تو آپ ہم ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہیں اور آپ کی اتباع ان لوگوں نے کی ہے جو ہم میں نیچ لوگ ہیں: وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا. [ہود:۲۷]

ہم جس ملک میں رہتے ہیں، اس میں کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو "ملأ قوم" بنا رکھا ہے، اور لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ بسا دیا ہے کہ وہ فرمانروائی اور حکمرانی ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں؛ کیوں کہ ان کی پیدائش خدا کے سر اور بازوؤں سے ہوئی ہے، وہ خدا اور بندہ کے درمیان واسطہ ہیں، ایک بہت بڑی قوم کو انھوں نے پیدائشی غلام بنا رکھا ہے، اور ان کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھا دی ہے کہ وہ نیچ اور کم تر ہیں، وہ دوسروں کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، پہلا طبقہ برہمنوں اور اونچی ذات کے لوگوں کا ہے جن کا عددی تناسب بہت معمولی ہے؛ لیکن وہ ملک میں ۶۵ فیصد کلیدی عہدوں پر قابض ہیں اور اقتدار کے در و بام پر ان کا ایسا قبضہ ہے کہ کوئی پتہ ان کی مرضی و منشاء کے بغیر حرکت نہیں کر پاتا، یہی قرآن کی اصطلاح میں اس ملک کے ملأ قوم ہیں، جن کا عمومی مزاج یہی ہے کہ جب تک حالات کے

ہاتھوں مجبور نہ ہو جائیں، عدل وانصاف اور سچائی کے سامنے سرخمیدہ نہیں ہوتے۔

دوسرا طبقہ ''دلت'' کا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں ''اراذل قوم'' کی تعبیر آئی ہے کہ لوگ انھیں نیچ، گنوار اور کم تر خیال کیا کرتے تھے، ہندوستان میں یہ قوم ہزاروں سال سے ظلم وجور کی چکی میں پیسی جارہی ہے اور انتہائی غیر انسانی رویہ کا شکار ہے، اب جب کہ سیاسی مصلحتوں کے تحت کسی قدر ان کی آؤ بھگت ہو رہی ہے، انھیں تحفظات دیے جارہے ہیں، الیکشن کے موقع پر انھیں منانے کی کوشش کی جاتی ہے، پھر بھی سماجی زندگی میں وہ ایک باعزت قوم کا مقام حاصل کرنے میں ناکام ہیں، اگر وہ گھڑے کو ہاتھ لگادیں تو اس پانی کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ کسی برہمن کے دوش بدوش بیٹھ کر کھا نہیں سکتے، اس ملک میں اعلیٰ ترین انتظامی قابلیت رکھنے کے باوجود جگ جیون رام ملک کے وزیر اعظم نہیں بن سکے؛ کیوں کہ وہ اچھوت قوم سے تعلق رکھتے تھے، ہندو قوم میں عقیدہ کے درجہ میں یہ تصور موجود ہے کہ یہ لوگ خدا کے پاؤں سے پیدا کیے گئے ہیں، ان کا کام ہی اونچی ذات کے لوگوں کی خدمت ہے، اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ چوں کہ آپ بہت ہی حقیر اور نیچ ہیں، اس لیے میں آپ کو فلاں سہولت دے رہا ہوں، تو بتایئے کہ یہ بجائے خود کس درجہ رسوا کن اور ذلت آمیز بات ہے!

جو لوگ مظلوم، دبے کچلے، اور دبائے ہوئے ہوں، ان کی مدد کرنا مسلمانوں کے لیے صرف سیاسی مصلحت نہیں؛ بلکہ دینی اور ملی فریضہ ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان لوگوں کے واسطے نہیں لڑتے، جو مغلوب ہیں، مرد، عورتیں اور بچے۔ [نساء: ۷۵]

قرآن نے یہاں مغلوبوں کے لیے ''مستضعفین'' کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی وہ لوگ جن کو دبایا گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ دلت بھی اس ملک کے ''مستضعفین'' ہیں تو شاید بے جا نہ ہو؛ اس لیے ان کو ساتھ لینا اور اس ملک کے ظالموں کو مشترک تدبیر کے ذریعہ ظلم سے باز رکھنا ہمارا اسلامی فریضہ ہے، بدقسمتی سے ہم نے اس اہم کام کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی؛ بلکہ ہندوؤں کی اونچی برادری سے متاثر ہوکر ان کے ساتھ کم وبیش وہی رویہ اختیار کیا؛ بلکہ ہم نے خود اپنی قوم میں بھی مختلف دیواریں کھڑی کرلیں، بعض اوقات یہ دیواریں اتنی اونچی ہوجاتی ہیں کہ پاس کا آدمی نظر نہیں آتا۔

اس صورت حال نے ہمیں دوہرا نقصان پہنچایا ہے، ایک تو اس ملک میں دعوت اسلام کا کام نہ ہونے کے درجہ میں ہے، اگر ہم اس طبقہ سے قریب ہوتے تو دعوت کے وسیع مواقع پیدا ہوسکتے تھے، ہر قوم میں دعوتِ حق کی فطری ترتیب یہی رہی ہے، کہ پہلے ایسے مستضعفین نے اس پر لبیک کہا ہے، پھر جب ان کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا تو بالآخر جو طبقہ انھیں نیچ گردانتا تھا، اس کے لیے بھی حلقہ بگوش اسلام ہونے کے سوا چارہ نہیں رہا، پہلے مکہ کے غلاموں نے اسلام قبول کیا، پھر اہلِ مدینہ نے، آخر ایک وقت ایسا آیا کہ سردارانِ مکہ بھی اسلام لانے پر مجبور ہوئے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسانیت ہے، یعنی خدا ایک ہے اور تمام انسانیت ایک ہے، کالے، گورے، عرب، عجم کی کوئی تفریق نہیں، ایک ہی مسجد میں سب کو خدا کی عبادت کرنی ہے، جو شخص دین سے زیادہ واقف اور عمل کے اعتبار سے زیادہ صاحبِ تقویٰ ہو، وہ نماز میں امام ہوگا، خواہ کسی خاندان کا ہو، اور اس کی چمڑی کا رنگ کیسا بھی ہو، انسانوں کا کوئی طبقہ خدا اور انسانوں کے درمیان واسطہ نہیں؛ بلکہ ہر انسان براہِ راست خدا سے مانگتا اور خدا سے پاتا ہے، یہ انسانی مساوات کا تصور اتنا فطری اور مبنی بر انصاف ہے کہ جن قوموں کو نیچ سمجھا جاتا ہے وہ اس کو اپنے لیے بہت بڑی رحمت باور کرتی ہیں، اگر اسلام کے اس عظیم اُصولِ زندگی کو ان محروم ومظلوم لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوں، اور اس ابرِ رحمت کے سایہ میں آنے سے انکار کریں، مگر افسوس، اور صد ہزار افسوس! کہ ہم نے کبھی سنجیدگی سے اس کام کی طرف توجہ نہیں دی۔

اس سے دوسرا نقصان سیاسی ہوا، آج سیاسی اعتبار سے ہم خود اچھوت ہیں، ہماری آبادی کے تناسب اور قومی اداروں میں ہماری تعداد کے درمیان کوئی نسبت نہیں، اگر مسلمان اس طبقہ کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہو جاتے، جن کی تعداد ملک میں ساٹھ، پینسٹھ فیصد سے کم نہیں، تو اگر ہم بادشاہ نہیں ہوتے تو بادشاہ گر ضرور ہوتے، جو لوگ اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کراتے ہیں اور فسادات کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، وہ دلتوں ہی کو اپنا ہتھیار اور آلۂ کار بناتے ہیں، اگر ہم انہیں قریب کرلیں تو ہم ان کے ہاتھ سے ان کے ہتھیار چھیننے میں کامیاب ہوجائیں۔

وقت ابھی بھی گیا نہیں ہے، اور ہمیں اس پہلو پر پوری گہرائی کے ساتھ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ حالات میں ایک منصوبہ کے

ساتھ اس طبقہ کو قریب کرنا چاہیے، مسلمان قائدین اور سیاسی تنظیموں کو چاہیے کہ دلت سیاسی و سماجی قائدین کے ساتھ تبادلۂ خیال کریں، انھیں قریب کریں، اور ان کی ذہن سازی کریں، بعض الیکشنوں میں اس کا کامیاب تجربہ ہوا ہے؛ اس لیے مسلمان قائدین کو اعلیٰ سطح پر دلت قائدین سے ربط قائم کرنا چاہیے، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے، سماجی سطح پر بھی دلت طبقہ سے رابطہ استوار کرنا ضروری ہے، مسلمان خوشی وغم کے مواقع پر ایسی تقریب رکھیں، جن میں انھیں مدعو کریں، شادی بیاہ کے موقع پر انھیں تحفے دیں، مسلمانوں کے زیر انتظام اسکولوں میں انھیں داخلے دیا کریں، اور جو ممکن ہو ان کے ساتھ رعایت کریں، دعوتوں میں ان کے ساتھ کھائیں، پئیں، ان کو بھائی، بہن، چچا، خالہ کہہ کر مخاطب کریں، ایسے الفاظ کے ساتھ ان سے خطاب نہ کریں، یا ان کا ذکر نہ کریں جن سے تذلیل وتحقیر کی بو آتی ہو، موقع بموقع اسلام کی مساوات کی تعلیم کو ان کے سامنے رکھیں، اگر ہم اپنے رویہ کو ان کے ساتھ درست کرلیں، تو ان شاء اللہ وہ جلد اور بہت آسانی کے ساتھ آپ کی طرف راغب ہوجائیں گے، ایک ایسی قوم جو انسان تسلیم کیے جانے کے لیے جد وجہد کر رہی ہے، اس سے تھوڑی سی محبت بھی دل جیتنے کے لیے کافی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ ہم اس معاملہ کی اہمیت کو محسوس کریں اور ایک ٹھکرائی ہوئی قوم کو سینہ سے لگائیں، اور انھیں محبت کی سوغات دیں، اس میں ہماری جان ومال کی حفاظت ہے، عزت وآبرو کا تحفظ ہے، سیاسی حقوق کا تحفظ ہے اور سب سے بڑھ کر اس سے دعوت کے وسیع مواقع حاصل ہوسکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

دولتِ عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ — تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ

مولانا عتیق احمد بستوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

جلد اول (صفحات ۴۸۸) قیمت -/450

جلد دوم (صفحات: ۷۰۴) قیمت -/550

جلد سوم (صفحات: ۵۶۰) قیمت -/500

کل میزان -/Rs.1500

رعایت کے بعد مع ڈاک مصارف -/1000 روپے میں دستیاب ہے۔

نئی مطبوعات دیدہ زیب طباعت دولت عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ کی مفصل داستان آسان اور دلنشیں پرایۂ بیان میں لکھی گئی۔

دولتِ عثمانیہ کا عروج وزوال، سلطان عبدالحمید ثانی کے دورِ خلافت اور ان کے کارناموں کی تفصیل، خلافتِ اسلامیہ کو ختم کرنے کا سانحہ، انجمن اتحاد وترقی اور مصطفیٰ کمال پاشا کے دورِ حکومت کے اہم واقعات، ترکی میں اسلامی بیداری کے حوصلہ افزا اقدامات وحالات، سلطان عبدالحمید ثانی کی دو ڈائریاں، نیز موجودہ صدر ترکی رجب طیب اردوگان کے مؤمنانہ اقدامات۔

مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام، لکھنؤ

ٹیگور مارگ، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539

موبائل نمبر 8318841286 / 9889378176

بارکوڈ یا اکاؤنٹ نمبر کے ذریعہ رقم جمع کرا کر تینوں جلدیں حاصل کرسکتے ہیں۔

Account N0 10863759700

ACADEMY OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATION

STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH LUCKNOW

IFSC CODE SBIN0000125

تعلیم وتربیت

مثالی استاذ کی خوبیاں

ڈاکٹر سراج الدین ندوی

تدریس ایک مقدس عمل ہے، اللہ تعالیٰ معلم کائنات ہے اور اس کے رسول معلم انسانیت ہیں، اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان اور نبی کو زیور تعلیم سے آراستہ کرکے آنے والی تمام بنی نوع انسان کو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی اور تعلیم و تزکیہ کو نبوی مشن قرار دیا، حضرت آدمؑ کو تعلیم دی: "وعلم آدم الاسماء کلھا" ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بارے میں فرماتے تھے: ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔'' [ترمذی] اس لیے ایک استاذ کے اندر پہلی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے پروفیشن کے تقدس کو برقرار رکھے، استاذ اور شاگرد کا رشتہ وہی ہوتا ہے جو ایک باپ کا اپنی اولاد سے ہوتا ہے، استاذ کو روحانی باپ کا مقام حاصل ہے، باپ بیٹے کے رشتہ میں بھی تقدس کا عنصر شامل ہے، اس رشتہ کا تقاضا ہے کہ استاذ اپنے شاگرد کا خیر خواہ ہو، اس کی عزت کا محافظ ہو، اس کے اخلاق کا نگراں ہو، استاذ معمارِ قوم ہے، اسی کے ہاتھوں میں ملک کا مستقبل ہے، نپولین بونا پارٹ نے کہا تھا: ''تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا''، اس قول میں ذرا سی ترمیم کرکے میں کہتا ہوں: ''تم مجھے اچھے استاذ دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا''، ضروری نہیں کہ ہر ماں بہت باصلاحیت ہو، ماں نیک ہوسکتی ہے، وہ اپنے بچے کو بہترین اخلاق سے آراستہ کرسکتی ہے، مگر ہوسکتا ہے وہ تعلیم نہ دے سکتی ہو، جب کہ ایک استاذ تربیت کے ساتھ تعلیم بھی دیتا ہے، اس لیے ایک استاذ کو اپنے پیشے کی اہمیت کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے، ذیل میں مثالی استاذ کے چند اوصاف کا باختصار ذکر کیا جاتا ہے، یہ وہ لازمی اوصاف ہیں جن کی جانب ہمارے اساتذہ وذمہ داران تعلیم کو توجہ دینا چاہیے۔

وہ مخلص ہو

ایک مثالی استاذ کی سب سے بڑی خوبی اس کا مخلص ہونا ہے، تعلیم کوئی جز وقتی ملازمت (Part time job) نہیں ہے، بلکہ ہمہ وقتی شغل ہے، ایک استاذ صرف کلاس یا اسکول کے احاطہ میں ہی استاذ نہیں ہوتا بلکہ وہ اسکول کے باہر مسجد اور بازار میں بھی استاذ ہوتا ہے، اسی طرح ایک استاذ دوران تعلیم ہی استاذ نہیں ہوتا بلکہ یہ رشتہ تاحیات قائم رہتا ہے، اگر آپ نے یہ طے کرلیا ہے کہ تدریس کو ہی ذریعہ معاش بنائیں گے تو اس کے لیے مخلص ہوجایئے، تبھی آپ اپنے پیشہ سے انصاف کرسکیں گے، آپ کا اخلاص اپنے پیشہ کے لیے بھی ہو اور اپنے شاگردوں کے لیے بھی، شاگردوں کے لیے مخلص ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے شاگردوں کو مثالی طالب علم بنانے کی کوشش کریں، ان کی کامیابی آپ کو ایسے ہی مطلوب ہو جیسے اپنی اولاد کی مطلوب ہوتی ہے، ان کی کامیابی پر آپ قلبی مسرت حاصل کریں اور ان کی ناکامی سے آپ کو تکلیف ہو۔

وہ علم کا حریص (Learner) ہو

علم ایک ترقی پذیر شے ہے، انسانی زندگی میں روزانہ تغیر واقع ہورہا ہے، آئے دن ملک کی سرحدیں بدل جاتی ہیں، نئی نئی ایجادات ظہور پذیر ہورہی ہیں، علم کی توسیع کا عمل مستقل جاری ہے، ایک وقت تھا جب ایک ڈاکٹر سبھی امراض کا علاج کرتا تھا، آج ہر عضو بدن کا الگ ڈاکٹر ہے، یہاں تک کے دائیں کان کا ڈاکٹر الگ اور بائیں کان کا الگ ہے، کوئی صرف ناک کا علاج کرتا ہے تو کوئی صرف آنکھ کا، آنکھ کی بھی الگ دنیا ہے، اس میں بھی درجنوں شعبے ہیں، اسی طرح زراعت اور دیگر شعبہائے حیات کا علم ہے، علم کی وسعت بغیر اندازہ ہے، ایک استاذ کی ذمہ داری ہے کہ وہ کم سے کم اپنے مضمون کے بارے میں اپ ڈیٹ رہے، وہ ہمیشہ سیکھتا رہے، اگر سیکھنے کا عمل رک جائے گا تو اس کا علم محدود ہوجائے گا، جس طرح تالاب میں اگر صاف پانی نہ ڈالا جائے تو ایک دن وہ تالاب یا تو سوکھ جاتا ہے یا اس کا پانی کثیف اور گندہ ہوجاتا ہے، اسی طرح ایک استاذ اگر اپنے علم میں اضافہ نہیں کرتا تو وہ اپنے شاگردوں کو تازہ علم نہیں دے سکتا۔

مقصد سے واقف ہو

آپ کیوں پڑھا رہے ہیں؟ اس کا جواب آپ کے پاس ہونا چاہیے۔ ایک جواب یہ ہے کہ پیسہ کمانا چاہتے ہیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ بچوں کو امتحان میں پاس ہونے کے قابل بنانا چاہتے ہیں، تیسرا جواب یہ ہے کہ بچوں کو اس قابل بنانا چاہتے ہیں کہ یہ پیسہ کماسکیں، چوتھا جواب یہ ہے کہ آپ اپنے شاگردوں کو دنیا اور آخرت میں کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں، ان

جوابات کے علاوہ بھی کچھ اور جوابات ہوسکتے ہیں، ہر جواب کے تقاضے اور نتائج الگ ہیں، اگر آپ کے پیش نظر صرف پیسہ کمانا ہی تعلیم وتدریس کا مقصد ہے تو پھر اخلاقیات کا ذکر ہی کیا، آج جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈاکٹر کو مریض سے ذرہ برابر ہمدردی نہیں ہے، وہ اس کی جیب پر نظر رکھتا ہے، یہاں تک کہ مریض کے مرجانے پر اس کی لاش بھی پیسے لے کر دی جاتی ہے، بعض ہسپتالوں میں مردہ کو بھی مصنوعی طور پر اس لیے زندہ رکھا جاتا ہے کہ اس کے ورثاء سے پیسہ لیا جاسکے، ایک انجینئر رشوت لے کر ایسی تعمیر کرادیتا ہے کہ ایک جھٹکے میں ہزاروں زندگیاں ختم ہوجاتی ہیں، ایک تاجر صرف پیسے کے لیے کم تولتا اور ملاوٹ کرتا ہے، یہ سب ان اساتذہ کی تعلیم کا نتیجہ ہے جن کے پیش نظر صرف پیسہ کمانا تھا، اگر آپ آخری جواب کو اپنا مقصد بنائیں تو آپ ایک صالح معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں، پیسہ تو بقدر قسمت آپ کو مل ہی جائے گا، دنیا میں پیسہ بہت کام آتا ہے لیکن پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، غلط راستوں اور لوگوں کا گلا کاٹ کر کمایا گیا پیسہ اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں ساتھ لاتا ہے، دولت کا حصول اچھی بات ہے؛ لیکن وہ آپ کے پاس جائز راستوں سے آنی چاہیے، ایک مثالی استاذ دولت کا پجاری نہیں ہوتا، وہ اپنے غریب شاگردوں کو بھی اتنی ہی توجہ سے پڑھاتا ہے جتنی توجہ سے وہ مالدار شاگردوں کو پڑھاتا ہے، اسکول میں ڈریس یونیفارم کا ایک مقصد یہ ہے کہ امیر اور غریب یکساں نظر آئیں اور استاذ کی نظر میں سب برابر ہوں، ایک مثالی استاذ کے سامنے تعلیم کا مقصد بھی واضح ہوتا ہے اور زندگی کا مقصد بھی۔

صلاحیتوں کو پہچاننے والا ہو

ہم جانتے ہیں کہ بچے کے اندر بے پناہ خداداد صلاحیتیں پنہاں ہوتی ہیں، ان صلاحیتوں کا پہچان کر ان کو نشو ونما دینا ایک مثالی استاذ کی خوبی ہے، کس بچے کے اندر کیا صلاحیت ہے؟ کون عالم دین بن کر رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے، کون ڈاکٹر بن کر علاج کرسکتا ہے، کس کے اندر انتظامی صلاحیت ہے، کون ایک اچھا اور ایمان دار تاجر بن سکتا ہے؟ کون مصنف اور مقرر ہوسکتا ہے؟ ان سب صلاحیتوں کا ادراک کرنا ایک استاذ کی ذمہ داری ہے، اس سلسلہ میں ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی صلاحیتوں کی شناخت کرکے ان کو اس میدان کا ماہر بنادیا، بعض صحابہ کو آپ نے مبلغ بنایا، بعض کو منتظم، بعض کو دوسری زبانیں سکھا کر مترجم بنایا اور بعض کو کاتب، بعض صحابہ کو آپ نے جاسوسی کی تربیت دی، بعض کو آپ نے سفارت کاری کا ہنر سکھایا، سپہ گری تو عرب کے ہر باشندے کی ضرورت تھی، اس وقت ہر شخص تیر اندازی، گھڑسواری اور تلوار بازی سیکھتا تھا، بعض لوگ اس فن میں بھی مہارت حاصل کرلیتے تھے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ہر میدان کے لیے صحابہ کو مخصوص تربیت دلائی، کیا آپ ڈیڑھ ہزار سال پہلے عرب ریگستان میں یہ تصور کرسکتے تھے کہ قیدیوں سے تعلیم کا کام لیا جائے؛ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے کافر قیدیوں سے مسلمانوں کو تعلیم دلائی، یہ تاریخ کا نہایت انوکھا واقعہ تھا۔

اللہ نے کوئی چیز بے کار پیدا نہیں کی، انسان تو اشرف المخلوق ہے، اسے اللہ نے اپنا نائب بنایا ہے، نائب کسی معمولی انسان کو نہیں بنایا جاتا، ضروری نہیں کہ ہر بچہ کتابی علم میں اچھا ہو، وہ کھیل میں نمایاں کارکردگی دکھاسکتا ہے، وہ ایک اچھا میکینک بن سکتا ہے، وہ ایک اچھا مصور ہوسکتا ہے، ایک استاذ کا کام ہے کہ وہ ہر بچے پر خصوصی نظر رکھے اور اس کی دلچسپیوں کا مطالعہ کرے، اور اس مطالعہ کی روشنی میں بچے کے مستقبل کی منصوبہ بندی کرے۔

خوش مزاج ہو

عام طور اساتذہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ خشک مزاج ہوتے ہیں، بچے ان سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں، بچوں کے معصوم ذہنوں پر ان کا خوف مسلط رہتا ہے، اس ماحول میں بچے اپنی صلاحیتوں کا کھل کر اظہار بھی نہیں کرپاتے، ایک استاذ کو بچوں کا اچھا دوست ہونا چاہیے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ بچے اس کا احترام بھی ملحوظ نہ رکھیں، احترام نہ کرنا الگ چیز ہے اور بچوں کا اپنے استاذ سے جائز بات کا کھل کر اظہار کرنا دوسری چیز ہے، ان دونوں میں لطیف سا فرق ہے، یہ استاذ کی صلاحیت کا کمال ہے کہ وہ بچوں کا دوست بھی ہو اور بچے اس کے سر پر ڈانس بھی نہ کریں، جب آپ بچوں کو باپ کی محبت دیتے ہیں، جب آپ ان کی خوبیوں کی تعریف کرتے ہیں اور ان کی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے فکرمند رہتے ہیں تو بچے بھی آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ ان پر جان چھڑکتے ہیں تو وہ آپ کے لیے جاں نثار ثابت ہوتے ہیں، ایک استاذ کو کلاس کا ماحول خوش گوار بنائے رکھنا چاہیے، دوران تدریس اچھے لطائف بھی سنانا چاہیے، کبھی بچوں کی دعوت کرنا چاہیے، کبھی کسی سیاحتی مقام کی سیر پر لے جانا چاہیے۔.....

بقیہ صفحہ ۲۷ پر

یادِ رفتگاں

تحریکِ ناموسِ صحابہؓ کے عظیم فرزند، جانشینِ امام اہلِ سنت ورکن مجلس انتظامی ندوۃ العلماء

مولانا عبدالعلیم فاروقیؒ کا سانحۂ ارتحال

شمع بجھ کر رہ گئی، پروانہ جل کر رہ گیا

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

۲۴؍ اپریل ۲۰۲۴ء کا سورج ایک ایسی اندوہناک خبر کیساتھ طلوع ہوا کہ آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور دل افسردہ۔ یہ خبر عظمتِ صحابہؓ وحرمتِ اہلِ بیتؓ کے پاسبان وامین حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کی خبر تھی، جو ساعتوں میں چاردانگِ عالم میں بجلی کی سی رفتار سے پھیل گئی، اور اِک عالم کو سوگوار کرگئی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت عرصہ سے علیل تھی، رمضان کے اواسط میں مزید دگرگوں ہوگئی، اور بعض مہلک امراض کا انکشاف ہوا، گھر ہی میں قیام گاہ اِک ہوسپٹل وارڈ میں تبدیل ہوگئی، اور اسباب کی اس دنیا میں جو کچھ تدبیر وعلاج اختیار کیا جاسکتا تھا، کیا گیا؛ لیکن تقدیر کا فیصلہ ہو چکا تھا: "ان أجل اللہ اذا جاء لا یؤخر".

جز ذاتِ خداوند کہ ہے دائم و قائم
دنیا میں سدا کوئی رہا ہے نہ رہے گا

جنازہ کی نماز سبزہ زار ندوۃ العلماء میں اِک جم غفیر نے اکابر علماء وارباب قیادت کی موجودگی میں مولانا مرحوم کے لائق فرزند جناب عبدالباری فاروقی قاسمی کی امامت میں ادا کی۔ عقیدت مندوں کے اصرار پر ندوہ سے عیش باغ قبرستان کی تقریباً سات کلومیٹر کی مسافت گرمی اور لو کی حالت میں پیدل طے کی گئی، راستہ بھر مجمع میں اضافہ ہوتا رہا۔ نمازِ جنازہ میں ملک کے مختلف حصوں سے لوگوں نے شرکت کی اور تدفین میں بیرونِ ملک سے بھی کئی افراد کی شرکت ہوئی۔

مولانا عبدالعلیم فاروقیؒ کی وفات ایک عالَم کی وفات کے مصداق ہے؛ وہ اِک عہد تھے؛ انھوں نے اپنی ۷۶؍سالہ زندگی کے تقریباً ۵۵؍ سال دعوت و اصلاح اور تصحیح عقائد میں صرف کیے، حق کی تبلیغ کے لیے وہ ہمہ وقت پابرکاب رہا کرتے تھے، ان کی عمر عزیز کا اک بڑا حصہ اسفار اور دوروں میں گذرا، اور راہِ حق میں انھوں نے ہر طرح کی مشقت برداشت کی، اور مجاہدہ کیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کاکوری لکھنؤ کے اس عظیم فاروقی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے بارہ میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اگر اس خانوادہ کی خدمات نہ ہوتیں تو شاید ریاست اودھ میں 'سنّیت' باقی نہ رہتی، اور سارے اہلِ سنت رفض وتشیع کا شکار ہوجاتے۔

مولاناؒ کے جدِ امجد حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ اور والد محترم مولانا عبدالسلام فاروقی رحمہ اللہ کے اسماء گرامی وخدمات علمی ودینی سے عوام وخواص سب واقف ہیں؛ ان حضرات نے جس طرح انتہائی ناگفتہ بہ اور ناسازگار حالات میں ناموسِ صحابہؓ کا تحفظ کیا اور اہلِ بیت کی محبت سے دلوں کو تازگی بخشی، وہ تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے جان کی بازی بھی لگائی، مقدمے بھی لڑے، مناظرے بھی کیے، جلسوں کا انعقاد بھی کیا، جلوس بھی نکالے اور ہر ذریعہ اختیار کیا۔

اہلِ بیت وصحابہ کرامؓ سے متعلق صحیح اسلامی عقائد وتصورات کی وضاحت اور تشریح جس اعتدال اور وسطیت کے ساتھ اسلافِ امت نے ماضی میں کی، اسی اعتدال اور وسطیت کو باقی رکھتے ہوئے مولانا عبدالشکور فاروقی رحمہ اللہ اور ان کے اخلاف نے اس دور میں کی، اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس موضوع پر یہ خانوادہ اپنی اِک امتیازی شان رکھتا ہے۔

مولانا عبدالعلیم فاروقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس خاندانی روایت کی نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک آبیاری کی، اس غنچہ کے قدیم رنگ و بو کی حفاظت کی، اور اپنے ذوق سے نئے گلوں کا اضافہ کیا۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کی طرح یہ امتیاز بھی برقرار رکھا کہ اخلاق کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا، اور ایسے سخت نزاعی و اختلافی موضوع سے تعلق رکھنے کے باوجود لعن طعن، سبّ وشتم کی زبان استعمال کرنے سے مکمل پرہیز کیا، اور نہ یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی کا اسلوب اختیار کیا۔ وہ ایک پیروِ سنت و متبع شریعت اور صلاح وتقوی کی حامل شخصیت تھے، اور حقیقی معنی میں اِک عالمِ ربانی تھے۔

۱۲؍ ربیع الاول کا جلوس ہو یا محرم میں عظمتِ صحابہؓ کے جلسے، اس خانوادہ کی خدمات دینِ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے لیے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ یہ جلوس اور جلسے ہی تھے کہ ایک طرف جہاں برملا اہلِ بیت سے متعلق لن ترانیاں، اور صحابہ کرامؓ سے متعلق ہرزہ سرائیاں کی جاتی تھیں، تو اہلِ سنت کے سینوں میں انہی سے ٹھنڈک پڑتی تھی، اور عقیدت مندوں کا ذہنی خلجان دور ہوتا تھا، انھیں صحیح بات کتاب وسنت، اقوال علماء سلف اور تاریخ کے مستند حوالوں سے بتائی جاتی تھی۔ ان کے

اسلاف کا قائم کردہ مدرسہ 'دار المبلغین' بھی اسی مقصد کے تحت قائم کیا گیا، اور اس سے سینکڑوں کی تعداد میں ایسے افراد تیار کیے گئے، جنھوں نے دینِ اسلام میں اہلِ بیت وصحابہؓ کرام کے صحیح مقام و منزلت سے اہلِ ایمان کو روشناس کرایا، اور اعداء اسلام کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔

گرچہ مولانا فاروقیؒ کا موروثی موضوع عظمتِ اہلِ بیت و ناموسِ صحابہؓ تھا، تاہم انھوں نے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایما پر ردّ قادیانیت پر بڑا کام کیا، اس سلسلہ میں انھوں نے تحریر وتقریر دونوں سے کام لیا، جلسے منعقد کیے اور متاثرہ علاقوں کے دورے بھی کیے، جن کا خاطر خواہ نتیجہ سامنے آیا۔ گذشتہ سالوں میں شکیل بن حنیف کے فتنہ نے جب سر اٹھایا تو اس موقع پر بھی مولاناؒ نے پوری ایمانی غیرت وحمیت کا ثبوت دیا، اور فتنہ کی سرکوبی کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

مولانا عبدالعلیم فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ۱۹۴۸ء میں ایک ایسے گھرانہ میں ہوئی جو غیرتِ ایمانی اور علم وفضل میں خاص مقام رکھتا تھا۔ مولاناؒ نے حفظِ قرآن' لکھنؤ کے معروف و مشہور ادارہ 'مدرسہ فرقانیہ' سے کیا، اور ۱۴ سال کی عمر میں محراب سنائی، اس کے بعد عربی وفارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والدِ محترم مولانا عبدالسلام فاروقی اور جد محترم حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہما سے حاصل کی، کافیہ اور شرح جامی کی تعلیم کے بعد 'مظاہر علوم' سہارنپور کا رخ کیا، اور وہاں کے ارباب علم وفضل سے موقوف علیہ (مشکوٰۃ) تک تعلیم حاصل کی، اور اخیر میں ۱۹۶۹ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے، اور اگلے مزید دو سال دار العلوم ہی سے تحصیل ادب کیا۔ مظاہر علوم میں انھوں نے بہ طور خاص حضرت مولانا اسعد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم مظاہر علوم سے فیض اٹھایا، اور ان کے منظورِ نظر بن کر رہے، ان کے علاوہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی وشیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری رحمہما اللہ کے شاگرد رہے۔ دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے مشائخ کے علاوہ تخصص فی الادب میں انھوں نے بطورِ خاص عربی زبان و ادب کے رمز شناس مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فیض اٹھایا۔

۱۹۷۱ء میں دار العلوم دیوبند سے تخصص فی الادب کرنے کے بعد وطن واپس آئے اور 'دار المبلغین' میں بحیثیت مدرس تقرر ہوا، کچھ عرصہ بعد والد بزرگوار کا انتقال ہوا تو آپ کو مدرسہ کا مہتمم نامزد کیا گیا، اور 'مجلس تحفظِ ناموسِ صحابہ' کے صدر قرار پائے۔

مولانا فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کو ملک کے بڑے اداروں اور تحریکوں میں بھی بڑا مقام حاصل تھا، چند سال قبل آپ کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی (شوریٰ) میں شامل کیا گیا تھا، دار العلوم دیوبند کی شوریٰ میں آپ پہلے ہی شامل تھے، اس کے علاوہ آپ عرصہ تک 'جمعیۃ علماء ہند' کے جنرل سیکریٹری رہے، اور اس کے بعد صدر جمعیت حضرت مولانا ارشد مدنی حفظہ اللہ کے نائب کی حیثیت حاصل ہوئی، 'امارتِ شرعیہ یوپی' کے آپ صدر تھے، 'امارت شرعیہ ہند' کی شوریٰ کے رکن تھے، اور مجلسِ تحفظِ ناموسِ صحابہ کے صدر تھے۔ مولانا کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ وہ ہند میں وقت کی دونوں عظیم الشان ہستیوں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید محمد ارشد مدنی حفظہ اللہ کے منظورِ نظر تھے، اس سے قبل ان کو مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہات حاصل تھیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دعوتی، تبلیغی، اصلاحی اسفار کثرت سے کیے، ملک ہندوستان کا شاید ہی گوشہ رہ گیا ہو جہاں انھوں نے قدم نہ رکھا ہو، بیرونِ ملک انھوں افریقی ممالک، خلیجی ممالک، سعودیہ، عراق، برما، انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، بنگلادیش پاکستان اور دیگر ممالک کے سفر کیے، جن میں بعض ممالک میں ان کا بکثرت جانا ہوا، اور انھوں نے اپنے علم وفضل سے لوگوں کی تشنگی دور کی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی طبیعت ومزاج کے اعتبار سے بڑی متواضع اور منکسر المزاج شخصیت تھے، ادبی ذوق بہت اعلیٰ تھا، ہر جملہ نپا تُلا ہوتا، عربی، فارسی اور اردو کے اشعار زبان زد تھے، تفسیر قرآن میں بڑا درک رکھتے تھے، اور تلاوتِ قرآن کا بھی بڑا شغف تھا، فقہ سے ان کو خاص مناسبت تھی، اور فقہی مسائل اور فتاویٰ پر گہری نظر تھی، مزاج میں قدرے ظرافت تھی؛ لیکن کیا مجال کہ کوئی اربابِ علم و فضل کے معیار سے گری ہوئی بات زبان سے نکل جائے۔ ان کی مجلسیں، علمی نکات سے عبارت تھیں، اہلِ علم ان کے سامنے اور خاص طور پر ان کے موضوع پر بولنے کی جرأت مشکل سے کر پاتے تھے۔ رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ و جزاہ عن الأمۃ الاسلامیہ بما ھو أھلہ.

مولاناؒ کے پسماندگان میں مولانا کی اہلیہ محترمہ سید مجتبیٰ حسنی مرحوم کی صاحبزادی، مفکرِ اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ کی بھانجی، اور حضرت کی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کی تربیت یافتہ ہیں، سب سے بڑے صاحبزادہ عبدالرحمٰن فاروقی ہیں، جو دار العلوم دیوبند سے فارغ اور فاضلِ ادب ہیں، عربی ادب سے خاص شغف رکھتے ہیں، اور دوسرے صاحبزادہ عبدالباری فاروقی ہیں، سابق نائب مدیر 'تعمیر حیات' مولانا محمود حسن حسنی ندوی

مرحوم کے بہنوئی ہیں، یہ بھی دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں، اچھے مقرر اور خطیب ہیں، مولانا کے بعد دارالمبلغین کا اہتمام انہی کے ذمہ آیا ہے، تیسرے صاحبزادہ عبدالمالک فاروقی ہیں جو اچھی انتظامی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مولانا کی ایک صاحبزادی ہیں جو مفتی محمد ارتضاء الحسن کاندھلوی حفید مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی رحمہ اللہ مقیم حال قطر سے منسوب ہیں۔ مولانا کے احفاد میں ابو الحسن علی فاروقی، محمد فاروقی اور حنین فاروقی ہیں، اول الذکر دار العلوم ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدینہ منورہ و عرب کے علماء سے فیض حاصل کر چکے ہیں، اور مؤخر الذکر دونوں دار العلوم ندوۃ العلماء میں زیرِ تعلیم ہیں۔

مولانا کے چھوٹے بھائی جناب عبد العظیم فاروقی جو ہمیشہ مولانا کے ہمدم و ہمساز رہے، اور دونوں کے درمیان مثالی محبت دیکھنے کو ملی، مولانا کے مشن میں ہمیشہ ان کے مشیرِ خاص رہے، اور ان کے صاحبزادہ حسن فاروقی سے بھی مولانا اولاد کی طرح محبت کرتے تھے، اور اہم کاموں میں شریک رکھتے تھے۔ اس طرح یہ خانوادہ علم دین کی خدمت اور خیر کے کاموں میں مصروف ہے، اور 'ایں خانہ ہمہ آفتاب است' کا مصداق ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی دینی، علمی و ملی خدمات کو قبول فرمائے، اور ان کے اخلاف میں علماء و صلحاء اور دعاۃ و مبلغین کا سلسلہ باقی رکھے، اور ان کے چھوڑے ہوئے مناصب کے لیے بہترین جانشین پیدا فرمائے؛

یہ کمالِ زندگی ہے کہ جب آفتاب ڈوبے
تو فلک کو نور دے کر نئی انجمن سجادے

رشید کوثر فاروقی

☆☆☆☆☆

.....بقیہ صفحہ ۲۴ رکا

وضع قطع بود و باش سنجیدہ ہو

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ بچہ اپنے استاذ کی نقل کرتا ہے، وہ اپنے استاذ کو والدین کے مقابلہ پر آئیڈیل مانتا ہے، اسے اپنے استاذ کے علم پر دنیا کے باقی لوگوں سے زیادہ اعتماد ہوتا ہے، اس لیے استاذ کی وضع قطع اور بود و باش کا بچے کی شخصیت پر بہت اثر پڑتا ہے، ہر زمانے میں شرافت کا لباس اور صالح طرز زندگی غیر صالح طرز زندگی سے الگ رہی ہے، بھری محفل میں آپ لوگوں کے پہناوے اور چال سے ان کی علمیت اور خاندانی نجابت کا اندازہ لگا سکتے ہیں، سر پر لمبی لمبی زلفیں، نامناسب جگہوں سے پھٹی جینس، ہاتھ میں سگریٹ ہو تو آپ بلا تکلف کہہ سکتے ہیں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے استاذ نہیں ہو سکتا، ایک مثالی استاذ کی ہر ادا سے وقار ٹپکتا ہے اور عظمت جھلکتی ہے، اس لیے استاذ کو چاہیے کہ وہ اپنے لباس اور بود و باش کو اخلاقی حدود کے دائرے میں رکھے۔

خوش گفتار ہو

خوش گفتاری میں دو باتیں شامل ہیں: ایک یہ کہ زبان کا آہنگ معتدل ہو، نہ اتنا پست کہ خود اور خدا کے سوا کوئی نہ سن سکے اور نہ اتنا بلند کہ ہمسائے بھی دوڑے چلے آئیں، قرآن کے مطابق حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں فرمائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ: ''اپنی آواز کو پست رکھو، بے شک گدھے کی آواز سب سے مکروہ ہے۔'' [لقمان: ۱۸] ایک استاذ کو چاہیے کہ کلاس میں پڑھاتے وقت بھی اس بات کا خیال رکھے کہ اس کی آواز سے برابر والی کلاس ڈسٹرب نہ ہو۔

زبان کے تعلق سے دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ جو زبان بھی بولے اس کی فصاحت و بلاغت اور گرامر کا خیال رکھے استاذ کی گفتگو طلبہ کے لیے سند اور حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے، آپ اردو، ہندی بولیں یا انگریزی؛ لیکن زبان کے معیار کو گرنے نہ دیں، بعض اساتذہ طلبہ سے گفتگو کے وقت اپنی دیہاتی زبان کا استعمال کرتے ہیں جو غیر فصیح ہوتی ہے، طلبہ استاذ کے ذریعہ بولے گئے الفاظ کو ڈکشنری میں تلاشیں تو انھیں نہ ملیں، بعض علاقوں میں لکھنے والی زبان الگ ہے اور بولنے والی الگ، استاذ کو کوشش کرنا چاہیے کہ لکھنے والی زبان کا ہی استعمال کرے۔

اعلیٰ کردار کا حامل ہو

استاذ کا کردار تعلیم و تربیت میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس کی اخلاقی صفات کا پرتو طالب علم پر سورج کی روشنی کی طرح پڑتا ہے، طلبہ کے سامنے جھوٹ بولنا، غیبت کرنا یا بد دیانتی کرنا استاذ کی اپنی تصویر کو خراب کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے اخلاق کو خراب کرنے کا موجب بھی ہے، کیا اس کردار کے اساتذہ کوئی صالح معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں، ایک مثالی استاذ اعلیٰ اخلاقی صفات کا حامل ہوتا ہے، اس کی سچائی اور ایمانداری، اس کی عفت و پاک دامنی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

مختصر یہ کہ استاذ کے اوپر سماج اور ملک کی ایک بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ قوم و ملک کے معماروں کا تخلیق کار ہے، وہ جیسے معمار بنائے گا ملک اور سماج ویسا ہی تیار ہوگا، اس پہلو سے ہر استاذ کو چاہیے کہ وہ اپنا جائزہ لے اور اپنے اندر مثالی استاذ کی لازمی خصوصیات کو پیدا کرے۔

☆☆☆☆☆

زبان وقلم

ہندوستانی میڈیا میں اردو صحافت کا کردار

ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی

۲۹ رجنوری ۱۷۸۰ء میں شہر کلکتہ سے جیمز اگسٹس ہکی نے ہکیز بنگال گزٹ یا کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر کی اشاعت کا آغاز کیا، یہ ہندوستان کا پہلا اخبار تھا جو ہفت روزہ نکلتا تھا، راجا رام موہن رائے نے دسمبر ۱۸۲۱ء میں ایک ہفتہ وار بنگالی اخبار "سمبد کمودی" جاری کیا۔

اسی طرح اردو زبان میں منشی سدا سکھ مرزاپوری نے ۲۷ رمارچ ۱۸۲۲ء میں شہر کلکتہ ہی سے ''جامِ جہاں نما'' نکالا، یہ اخبار ۲۷ رمارچ ۱۸۲۲ء سے ۲۳ رجنوری ۱۸۲۸ء تک جاری رہا۔

اسی طرح ۲۰ راپریل ۱۸۲۲ء کو راجہ رام موہن رائے نے فارسی زبان میں کلکتہ سے ''مرآۃ الاخبار'' نکالا، اردو کا پہلا روز نامہ ''اردو گائیڈ'' بھی کلکتہ سے ہی شائع ہوا تھا جسے ۱۸۵۸ء میں مولوی کبیر الدین احمد خان نے نکالا تھا، ۱۸۲۶ء میں جگل کشور شکلا نے ہندی زبان میں ''اودنت مارتنڑ'' شائع کیا، اس طرح ہم شہر کلکتہ کو صحافت کی جنم بھومی کہہ سکتے ہیں۔

۱۸۳۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان بنا دیا، اردو زبان پہلے رائج تھی، اب وہ ترقی کی نئی منزلیں طے کرنے لگی ایسے ماحول میں دہلی سے اردو کا پہلا اخبار ''دہلی اردو اخبار'' مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۷ء میں نکالا۔

''غدر'' سے پہلے دہلی سے نکلنے والا یہ ''دہلی اردو اخبار'' اردو کا سب سے با اثر، عمدہ اور دلیر اخبار تھا جسے علامہ محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے جاری کیا تھا، جو غدر کے بعد انگریزوں کی مخالفت اور جہاد آزادی کی حمایت کرنے کی پاداش میں شہید کر دیے گئے تھے، اور حق کی راہ میں جان دینے والے پہلے اخبار نویس ہوئے، اس اخبار میں علامہ محمد حسین آزاد بھی اپنے والد کی قلمی مدد کیا کرتے تھے اس لیے وہ بھی گرفت میں آنے والے تھے مگر بچ گئے تھے، دہلی کا اس زمانے کا ایک اور اردو اخبار ''صادق الاخبار'' بھی بڑا جری اور بے باک اخبار تھا، غدر سے پہلے سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد صاحب نے بھی ایک اخبار ''سید الاخبار'' کے نام سے نکالا تھا اور سر سید احمد خاں بھی اس میں تحریری کام کیا کرتے تھے''۔

[اردو صحافت از انور علی دہلوی، ص ۴۶]

بلاشبہ ''جام جہاں نما'' اور ''دہلی اردو اخبار'' نے اردو صحافت کی آبیاری میں غیر معمولی رول ادا کیا، اس کے بعد انیسویں صدی کی آخری دہائی میں درجنوں اخبارات شائع ہوئے، جیسے ۱۸۴۷ء میں قمر الدین خاں کا ''سعد اخبار'' ۱۸۴۸ء میں، ''شملہ اخبار'' شملہ سے، ۱۸۵۳ء میں ''نور مغربی'' اور ''نور مشرقی'' دہلی سے، ۱۸۵۲ء میں ''فتح اخبار'' علی گڑھ سے ۱۸۵۳ء میں ''گوالیار اخبار'' گوالیار سے ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور کا ''اودھ اخبار'' لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں، ''قیصر اخبار'' منشی سراج الدین خاں کی ادارت میں الٰہ آباد سے ۱۸۸۱ء میں، ریاض خیر آبادی کا ''ریاض اخبار'' خیر آباد سے ۱۸۸۳ء میں، ''فتنہ عطر فتنہ'' گورکھپور سے ۱۸۷۷ء میں، لکھنؤ سے ''اودھ پنچ'' ۱۸۸۲ء میں اٹاوہ سے، ''نجم اخبار ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ سے، ''دلگداز'' مولانا عبد الحلیم شرر نے جاری کیا ۱۸۸۵ء میں، امرتسر سے ''وکیل'' ۱۸۹۹ء میں، اکبر علی اکبر آبادی نے فیروز آباد سے ''ادیب'' جاری کیا۔

''بیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہی صحافت کے میدان میں انقلاب برپا ہو گیا، چونکہ عوام کے اندر غلامی کی راکھ میں جو چنگاری دبی ہوئی تھی وہ اب شعلہ کی شکل اختیار کر چکی تھی، لہٰذا اس صدی کے زیادہ تر اخبارات نے عوام کو بیدار کر کے انگریزوں کے خلاف نبرد آزما کرنے کا کام کیا، ۱۹۰۱ء میں انشاء اللہ خاں انشاء کی ادارت میں ''اخبارِ وطن'' اور عبد القادر کی ادارت میں لاہور سے ''مخزن'' جاری ہوا، ۱۹۰۳ء میں منشی شیو برت لال دامن کی ادارت میں بریلی سے ''زمانہ'' جب کہ لاہور سے معراج الدین احمد خاں کا ہفتہ وار ''زمیندار'' جاری ہوا- ان کے صاحب زادے مولانا ظفر علی خاں نے ۱۹۱۰ء میں اس کی ادارت سنبھالی اور بڑی شان کے ساتھ انگریزوں کے خلاف قلمی جنگ جاری رکھی جس کی وجہ سے کئی بار ضمانتیں اور پریس ضبط ہوا مگر حکومت اخبار کی آواز کو نہ دبا سکی''۔

[ہندوستانی میڈیا اور اردو، ص ۳۷-۳۸]

۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت موہانی نے ''اردوئے معلیٰ'' علی گڑھ سے نکالا، اسی وقت مولانا ابو الکلام آزاد بھی ''لسان الصدق'' کے ذریعے میدانِ صحافت میں آئے؛ لیکن مولانا ابو الکلام آزاد کی صحافی زندگی کا آغاز ''نیرنگ عالم'' اور ''المصباح'' سے ہوا تھا- بلاشبہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی کو اردو کے انقلابی صحافت کا جنم داتا کہنا برحق ہے، ان دونوں نے صحافت اور آزادی کی جد جہد میں بے مثال

قربانیاں بھی پیش کیں، ایک بیان کے مطابق ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ بھی مولانا حسرت موہانی کی زندہ جاوید یادگار ہے۔

''تحریک ندوۃ العلماء کے ترجمان ماہنامہ ''الندوۃ'' کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۰۴ء میں منظر عام پر آیا، رسالے کے دو اڈیٹر تھے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا شبلی نعمانی۔ الندوۃ نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو مستقبل میں علم وفن، ادب و صحافت اور معاشرت و سیاست کے میدان میں ممتاز مقام پر فائز ہوئے، ان میں اہم مولانا ابو الکلام آزاد ہیں، اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا آزاد الندوۃ کے سب اڈیٹر رہے، اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، ندوہ میں قیام، مولانا شبلی کی تربیت اور اپنی خدا داد ذہانت و صلاحیت کی بدولت وہ برابر ترقی کرتے گئے، الندوہ میں ان کے مضامین نے انھیں پورے ملک میں شہرت بخشی''۔

[تاریخ ندوۃ العلماء: ج۱/ص ۳۱۱]

آسمان صحافت کے بیباک صحافی، مجاہد آزادی اور قومی آواز کے بانی اڈیٹر حیات اللہ انصاری نے اردو صحافت کو بام عروج تک پہنچایا، بقول معروف صحافی قطب اللہ ندوی: ''حیات اللہ انصاری نے اردو صحافت کو جدید انگریزی صحافت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا ڈھنگ سکھایا''۔

حیات اللہ انصاری نے صحافتی زندگی کا آغاز ہفتہ وار اخبار ''ہندوستان'' سے شروع کیا تھا اور بعد میں قومی آواز کے بانی اڈیٹر بنے، ان کی چالیس سالہ صحافتی زندگی میں تقریباً تیس سال تک قومی آواز کے اڈیٹر رہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ حیات اللہ انصاری نے ہندوستان میں غیر جانبدار اور معروضی صحافت کی ایسی داغ بیل ڈالی جو اس سے قبل عنقا تھی۔

نامور صحافی سہیل انجم رقمطراز ہیں: ''قومی آواز کی ادارت کے زمانے ہی میں حیات اللہ انصاری نے وہ معرکہ آرا ناول لکھا تھا جس کا نام ''لہو کے پھول'' ہے اور جس پر انھیں ۱۹۷۰ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا، لہو کے پھول پانچ جلدوں میں ہے اور اس کی مجموعی ضخامت ۲۶۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس ناول کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ بعض نقادوں کے مطابق لہو کے پھول میں صحافت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے''۔

[اردو صحافت، ص ۱۱۸]

اسی طرح جولائی ۱۹۱۲ء کو مولانا ابو الکلام آزاد نے کلکتہ سے ہفتہ وار ''الہلال'' جاری کیا اور جب ۱۹۱۴ء میں ''الہلال'' بند ہوا تو مولانا نے ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو ''البلاغ'' جاری کیا جب کہ مولانا محمد علی جوہر نے ۲۳ر فروری ۱۹۱۳ء کو دہلی سے روزنامہ ''ہمدرد'' جاری کیا جو ۱۹۱۵ء تک جاری ہوتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری نے ہفتہ روزہ ''اخبار اہلحدیث'' جاری کیا جو مسلسل ۴۴ر سال تک نکلتا رہا۔

۱۹۱۶ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ادارت میں ''معارف'' یکم مئی میں ۱۹۱۲ء کو بجنور سے ''مدینہ'' جاری ہوا جس کے مالک محمد مجید حسن تھے، یہ اخبار انقلابی اخبار کے نام سے بھی عوام میں مقبول ہوا، ۱۹۱۷ء میں کلکتہ سے قاضی عبد الغفار کا روزنامہ ''جمہوریہ'' ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد سے ''پیام''، پنڈت برج نرائن چکبست کا ''صبح امید'' ۱۹۱۸ء میں اور ذوالقدر جنگ کا روزنامہ اخوت لکھنؤ سے ۱۹۱۹ء میں، ''سیاست'' ۱۹۲۰ء میں، روزنامہ ''رعیت'' خواجہ حسن نظامی کی ملکیت میں اور گورکھپور سے سید شاہ نذیر باغی کا ''التحقیق''، بابائے اردو عبد الحق کی ادارت میں حیدرآباد سے ۱۹۱۲ء میں سہ ماہی اردو، ۱۹۲۱ء میں عبد الرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں ''پیغام''، ۱۹۲۴ء میں محمد یوسف حسین کا ''نیرنگ خیال''، ۱۹۲۵ء میں دہلی سے ''الجمعیۃ''، ۱۹۲۷ء میں ماہنامہ ''دعوت'' مولانا آزاد سبحانی کی ادارت میں گورکھپور سے، ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے جالب دہلوی کا روزنامہ ''ہمت''، ۱۹۳۱ء میں عبد الرزاق ملیح آبادی کا ''الہند''، ۱۹۳۰ء میں آگرہ سے ''تسنیم''، ۱۹۳۱ء میں پٹنہ سے ''ندیم'' اور لکھنؤ سے ''سرپنچ'' و ''حریم''، ابو محمد مصلح نے ۱۹۳۲ء میں ''ترجمان القرآن'' نکالا، بعد میں ۱۹۳۳ء میں مولانا ابو الاعلی مودودیؒ باقاعدہ مالک و مدیر بنے، ۱۹۲۵ء میں مولانا عبد الماجد دریابادی کا ''سچ''، ۱۹۳۴ء میں مولانا منظور نعمانی کا ماہنامہ ''الفرقان''۔

۱۹۳۶ء میں پٹنہ سے ''معیار'' اور ہفتہ وار ''مسلم''، ۱۹۳۸ء میں بھوپال سے ''رہبر وطن''۔

[ہندوستانی میڈیا اور اردو، ص ۳۹]

ہندوستانی میڈیا میں اردو صحافت کی غیر معمولی خدمات کا اندازہ شاہد کمال کے اس شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

تاریخ اسے کیسے فراموش کرے گی
وہ جنگ جو اردو کی صحافت نے لڑی ہے

ہندوستان کی ملی، ثقافتی، تہذیبی، لسانی، اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور اخلاقی قدروں کو پھیلانے کے لیے جو گرانقدر خدمات اردو صحافت نے انجام دی ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی صحافت کی تاریخ جب جب لکھی جائے گی، اس تاریخ

میں سب سے اہم اور درخشندہ باب اردو صحافت ہی کا ہوگا۔

۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہونے والے اردو کے پہلے ہفت روزہ ''جام جہاں نما'' سے اگست ۱۹۴۷ء میں بھارت کے آزاد ہونے تک تحریک آزادی کے پروان چڑھانے میں سب سے زیادہ اردو صحافت ہی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

''تاریخ شاہد ہے کہ جن اخبارات اور رسائل کے مدیروں اور صحافیوں کو دار و رسن اور قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں بڑی تعداد اردو اخباروں کے مالکان، مدیران اور صحافیوں ہی کی تھی، یہی نہیں حکومت برطانیہ نے جدوجہد آزادی کے لیے عوام میں بیداری نیز جوش و ولولہ اور جذبۂ حریت پیدا کرنے والے جن اخباروں پر پابندی لگائی، ضمانتیں ضبط کیں، پریس بند کیے، ان میں بڑی تعداد اردو جرائد کی تھی، ان سب کے باوجود اردو اخبارات کے مدیران، مالکان اور صحافی انگریزوں کے ظلم و استبداد کے خلاف سینہ سپر رہے، اس وقت بیشتر اردو اخبار تجارت کے بجائے ایک مشن کے تحت شائع ہو رہے تھے اور یہ مشن تھا ملک کو فرنگیوں کی غلامی سے نجات دلانا، سامراجی حکومت کو ختم کرنا اور ملک کو آزاد کرانا، اسی مشن کے تحت اردو صحافت نے سب سے پہلے فرقہ وارانہ اتحاد پر زور دیا، کیونکہ انگریزوں نے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے اصول پر عمل کر کے ہی اقتدار حاصل کیا تھا اور وہ اس پر آخر تک کاربند رہے''۔[اردو صحافت اور علماء، ص۲۳]

الغرض اردو صحافت کی ابتداء ہی ملک کو انگریزوں کے مذموم عزائم اور ان کی دسیسہ کاریوں سے پاک کرنے اور انگریزی حکومت کی چیرہ دستیوں کو بیقاب کرنے سے ہوئی تھی، بقول عبد السلام خورشید برِ اعظم میں Passive Resistance کا نعرہ اور تصور سب سے پہلے مولانا حسرت موہانی نے دیا، اس کے لیے انہوں نے ''مزاحمت دفاعی'' کی اصطلاح ایجاد کی، اسی تصور نے بعد میں ''ستیہ گرہ'' کا نام پایا۔

آج مقام افسوس یہ ہے کہ جمہوریت کا چوتھا ستون کہی جانے والی میڈیا اپنا اعتماد کھوتی نظر آرہی ہے؛ لیکن اس کے باوجود اردو صحافت آج بھی بڑی حد تک عوام میں غیر جانبدارانہ اور غیر متعصّبانہ صحافتی رول ادا کر رہی ہے، آج جبکہ صحافت مشن کے بجائے تجارت بن گئی ہے؛ لیکن پھر بھی صحافت کی تجارت دوسری تجارتوں سے بہت مختلف ہے، اردو صحافت اپنے پرکھوں کی طرح عوام میں تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی، لسانی، ادبی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔

جمنا داس اختر اردو صحافیوں کی بیلوث خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''انقلاب زندہ باد کا نعرہ برصغیر کی جنگ آزادی میں دینے والے اردو صحافیوں نے نا مساعد حالات کے باوجود برطانوی سامراج کے خلاف جنگ میں جو نمایاں حصہ لیا اس کی کوء مثال کسی دوسری زبان کے صحافی پیش نہیں کر سکتے''۔

[ماہنامہ ''آجکل'' نومبر-دسمبر ۱۹۸۳ء ص۳۵]

آخر میں راقم اپنی بات صحافت سے متعلق دو نامور اور بیباک صحافیوں کے اقوال پیش کر کے ختم کرنا چاہتا ہے:

مولانا محمد علی جوہر ۲۹ر فروری ۱۹۲۸ء کے ''ہمدرد'' میں لکھتے ہیں: ''میں نے صحافت پیسہ کمانے کے لیے اختیار نہیں کیا، بلکہ ملک وملت کی خدمت کے لیے، میں رہنما ہوں رہزن نہیں''۔

اسی طرح کچھ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کہا: ''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں ونقصان میں آئے ہیں، صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت ودشنام کے طلبگار ہیں، عیش کے پھول نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں''۔

☆☆☆☆☆

قناعت ومساوات کی تعلیم

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو زہد وقناعت کی تعلیم دی تو خود اپنی زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش کر کے دکھایا، غزوۂ احزاب کے موقع پر جب بعض صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھوک کی شدت کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھایا کہ اس پر پتھر بندھا ہوا ہے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اپنا بطن مبارک کھول کر دکھایا جس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مساوات اور بھائی چارہ کی تعلیم دی تو سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا، اگر دوسرے مسلمان عام سپاہی کی حیثیت سے مدینہ طیبہ کے دفاع میں خندق کھودنے کی مشقت برداشت کر رہے تھے تو ان کا امیر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف قیادت ونگرانی کا فریضہ انجام دے رہا تھا، بلکہ بہ نفس نفیس کدال ہاتھ میں لیے کھودنے میں شریک تھا اور زمین کا جتنا بڑا ٹکڑا ایک عام سپاہی کو کھودنے کے لیے دیا گیا تھا اتنا ہی بڑا ٹکڑا اس نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

☆☆☆

روداد چمن

مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے زیر اہتمام

لیگل لیٹریسی کورس کا سالانہ پروگرام

رپورٹ: منور سلطان ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری سال کے طلبہ کو ملک کے دستور کی بنیادی باتوں سے واقف کرایا جائے تاکہ جب وہ میدان عمل میں جائیں تو بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرسکیں، اس مقصد کے لیے مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کی جانب سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اختصاص کے تمام شعبوں کے طلبہ کے لیے لیگل لٹریسی کورس شروع کیا گیا، جولائی ۲۰۲۳ء میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی صدارت میں اس کی افتتاحی نشست ہوئی، جس میں ناظم ندوۃ العلماء نے اس کورس کی افادیت کو بیان کرتے ہوئے کہا تھا: ''اس بات کی بڑی ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ مدارس کے فضلاء کو قانون سے واقف کرانے کا کوئی نظام بنایا جائے، آج الحمدللہ قانون کی بنیادی معلومات پر مشتمل یہ کورس ندوہ کی طرف سے شروع ہورہا ہے، مولانا نے مزید کہا کہ اس کورس کا مقصد وکیل بنانا نہیں ہے، بلکہ جو علماء فقہ اور قضاء سے وابستہ ہیں وہ اپنا کام اور بہتر طریقہ پر کرسکیں گے، اگر ہم ملک کے قوانین سے واقف نہیں ہوں گے تو قدم قدم پر مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا''۔

اس کورس کی تیاری کے لیے مولانا عتیق احمد بستوی کی صدارت میں پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی، کمیٹی کے ارکان کے نام اس طرح ہیں: جسٹس صبغت اللہ (ریٹائرڈ جج)، جناب ایس ایم حسیب (ریٹائرڈ جج)، پروفیسر نسیم احمد جعفری (ڈین فیکلٹی آف لا، انٹگرل یونیورسیٹی) پروفیسر کمال احمد خان (شعبۂ قانون لکھنؤ یونیورسیٹی) پروفیسر وحید عالم (شیعہ کالج آف لا)، کمیٹی کے اہم رکن پروفیسر نسیم احمد جعفری (ڈین فیکلٹی آف لاء، انٹگرل یونیورسیٹی) نے اس کورس کا بنیادی خاکہ تیار کیا، اور پھر کمیٹی کے ارکان کے اتفاق کے بعد تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا، حضرت ناظم ندوۃ العلماء کے مشورہ سے لاء کی تدریس کا نظام یہ بنایا گیا کہ ہفتہ میں ایک دن دو گھنٹے کی باضابطہ تدریس ہو، چنانچہ سنیچر کی شام مغرب تا عشاء اور سردی کے دنوں میں ظہر تا عصری تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔

فروری کے پہلے ہفتہ میں کورس کی تکمیل ہوئی، اور اس مناسبت سے سالانہ تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں طلبہ نے قانون کے مختلف موضوعات پر مقالات وتاثرات پیش کئے، جلسہ کی صدارت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء نے کی، مولانا عتیق احمد بستوی سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ نے مجلس کی سرگرمیوں کا تعارف کراتے ہوئے اس کورس کے مقاصد پر روشنی ڈالی، پروفیسر وسیم اختر بانی وچانسلر انٹگرل یونیورسیٹی اور پروفیسر نسیم احمد جعفری (ڈین شعبۂ قانون انٹگرل یونیورسیٹی)، مولانا خالد رشید فرنگی محلی (امام عیدگاہ لکھنؤ) اور جناب سلیمان رحیم آبادی صدر انجمن اصلاح المسلمین لکھنؤ بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ نے صدارتی تقریر میں کہا کہ: ملک کے قوانین سے واقفیت وقت کی اہم ضرورت ہے، ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کے قوانین سے واقف نہیں ہوں گے تو یہ عذر نہیں مانا جائے گا، مولانا نے اس کورس کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ندوۃ العلماء میں اس کورس کا تجربہ بہت اچھا رہا، اور طلبہ نے اس موضوع کو محنت سے سیکھا، مولانا نے خاص مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کے سکریٹری اور اس کورس میں پڑھانے والے اساتذہ کا شکریہ ادا کیا۔

انٹگرل یونیورسیٹی کے بانی چانسلر پروفیسر وسیم اختر نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ: ندوہ آکر ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے بچپن سے مل رہا ہوں، انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے گزارے ایام کو یاد کرتے ہوئے خاص طور پر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا ذکر کیا، اور انہیں اپنا محسن قرار دیا، انہوں نے مزید کہا کہ لیگل لٹریسی کی ضرورت ہر فرد کے لئے ہے تاکہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کرسکے، موجودہ وقت میں قانونی بیداری کی بڑی ضرورت ہے، اگر مدارس کے فارغین ملک کے بنیادی قوانین سے واقف ہوں گے تو ملک اور ملت کی زیادہ بہتر خدمت کرسکیں گے۔

مولانا عتیق احمد بستوی سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے مجلس کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی، انہوں نے لیگل لٹریسی پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ: اس کورس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس کے قوانین اور نظام سے واقف ہوں، مولانا نے مزید کہا کہ ملکی قوانین کے ساتھ اسلامی

قوانین سے بھی واقف ہونا ضروری ہے، اسی میں انسان اور انسانیت دونوں کی نجات ہے، پوری دنیا میں عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے اسلامی قوانین کو سمجھنا بہت ضروری ہے، انہوں نے کہا کہ ہمارے کچھ باصلاحیت طلبہ ہمت کریں تو وہ شرعی قوانین کے ساتھ ملکی قوانین میں بھی مہارت پیدا کرسکتے ہیں اور اسلامی قوانین کی تمام قوانین پر برتری ثابت کرسکتے ہیں۔

پروفیسر نسیم احمد جعفری ڈین فیکلٹی آف لاء، انٹگرل یونیورسیٹی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ: ندوۃ العلماء نے مدارس کے تعلیمی نظام میں ہمیشہ رہنمائی کی ہے، انہوں نے مزید کہا کہ آنے والے وقت میں اس کورس کا نتیجہ دیکھنے کو ملے گا، انہوں نے کہا کہ ندوۃ العلماء کے طلبہ کو پڑھانے سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہاں کے طلبہ عصری دانشگاہوں کے طلبہ سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ: مدارس کے طلبہ میں بڑی قابلیت اور صلاحیت ہوتی ہے، ان کی صلاحیتوں کو پہچان کر ان کی صحیح رہنمائی کی جائے تو بہتر نتائج سامنے آئیں گے، انہوں نے کہا کہ علماء شریعت سے واقف ہوتے ہیں، اگر ملکی قوانین سے بھی باخبر ہوجائیں گے تو اپنی بات زیادہ مؤثر انداز میں رکھ سکیں گے، انہوں نے کہا کہ ملک عزیز میں باعزت زندگی گزارنے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے قانون کا جاننا ضروری ہے۔

اس موقع پر طلبہ نے قانون سے متعلق درج ذیل موضوعات پر مقالات پیش کیے، جسے شرکاء پروگرام نے بہت پسند کیا:

۱- ہندوستان کا عدالتی نظام: مختصر تعارف (عبدالحق، اختصاص فی علوم الفقہ)

۲- دستور ہند اور انسانی حقوق (منظور عالم، اختصاص فی علوم الفقہ)

۳- دستور ہند اور اقلیتوں کے حقوق (محمد صالح لکھنوی، اختصاص فی علوم الفقہ)

۴- مسلم پرسنل لاء کی دستوری حیثیت (محمد عثمان، اختصاص فی علوم الحدیث)

۵- مذہبی آزادی کا دائرہ: دستور کی روشنی میں (عبدالرحمٰن مسلم، اختصاص فی علوم الفقہ)

۶- اظہار رائے کی آزادی اور اس کا دائرہ (طلحہ عزیز خان، اختصاص فی علوم الحدیث)

۷- گرفتاری سے متعلق ملکی قوانین (طیب خان، اختصاص فی علوم الفقہ)

ان کے علاوہ محمد فضیل اختصاص فی علوم الفقہ نے انگریزی میں، محمد نوشاد شعبہ صحافت ولسانیات نے ہندی میں، محمد مصعب اور عبیداللہ مطلوب نے اردو میں اپنے تاثراتی مقالات پیش کیے۔

اس تقریب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے متعدد اساتذہ شریک ہوئے، شرکاء نے طلبہ کے مقالات کو بہت پسند کیا، اور ان کی حوصلہ افزائی کی، مجموعی طور پر شرکاء کا تاثر یہ تھا کہ قانون کی تعلیم کا آغاز ایک بہترین پہل ہے، یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، ندوۃ العلماء نے اس سمت قدم آگے بڑھا کر ملت کو بڑا پیغام دیا ہے۔

واضح رہے کہ اس کورس میں اختصاص کے پانچ شعبوں (اختصاص فی التفسیر، اختصاص فی الحدیث، اختصاص فی علوم الفقہ، اختصاص فی التاریخ والدعوۃ، اختصاص فی الادب العربی) کے ساتھ شعبہ تدریب افتاء اور شعبہ صحافت و لسانیات کے طلبہ شریک ہوئے، ہر یونٹ کے اختتام پر ٹسٹ ہوا، اور پھر کورس کے اختتام پر باضابطہ اس کا امتحان ہوا، اور کامیاب ہونے والے طلبہ کو سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔

☆☆☆☆☆

زندگی کے سوتے مدارس سے وابستہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

مدرسوں کی بڑی قدر کی ضرورت ہے، یہ روشنی کے مینار ہیں، اگر یہ نہ رہیں گے تو تاریکی ہی تاریکی ہوگی، تب کوئی بتانے والا نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کس بات سے راضی ہوتا ہے، کس بات سے ناراض ہوتا ہے؟ اور کس بات پر پکڑ ہوگی اور کس بات پر پکڑ نہ ہوگی؟ اس کا بتانے والا کوئی نہیں رہ جائے گا، اس لیے یہ مدرسے چاہے دیکھنے میں کتنے ہی معمولی معلوم ہوتے ہوں؛ لیکن یہ بہت اہم ہیں، یہ اسکول وکالج جتنے بڑے بڑے اسکول وکالج ہوں، اگر وہ نہ رہیں تو آپ کا کوئی بڑا نقصان نہیں ہے، بس یہی تو ہوگا کہ بہت بڑی کوئی ملازمت آپ کو نہ ملے گی، آپ کاروبار کرلیجیے گا، یا کسی طریقہ سے اپنا پیٹ پال لیجیے گا، یہ مدرسے نہ ہوئے تو کوئی آپ کو بتانے والا نہ ہوگا کہ کس بات سے اللہ خوش ہوتا ہے، کس بات سے اللہ ناراض ہوتا ہے؟ اور کس بات سے آخرت میں کامیابی حاصل ہوتی ہے، کس بات سے آخرت میں تباہی ہوتی ہے؟ ان مدرسوں کی آپ قدر کیجئے، اور ان کی اہمیت کو سمجھئے، ہماری زندگی کے سوتے اور کامیابی کے چشمے ان سے پھوٹتے ہیں، ان ہی سے ہم کو معلوم ہوگا کہ کامیاب کون ہے؟ ناکام کون ہے؟

☆☆☆

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال: عازمین حج کو چھوڑنے ان کے رشتہ دار اور احباب اسٹیشنوں اور حج ہاؤس تک جاتے ہیں، اسی طرح واپسی میں استقبال کے لیے ایئرپورٹ تک آتے ہیں، ان میں مرد وعورت سب ہوتے ہیں، کیا شرعی نقطۂ نظر سے یہ درست ہے؟

جواب: حجاج کرام کو چھوڑنے کے لیے اسٹیشنوں یا حج کمیٹیوں تک جانا از روئے شرع درست ہے بلکہ باعث ثواب ہے، امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں حضرت حسنؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حاجی حج کے لیے روانہ ہوں تو تم ان کو وداع (چھوڑنے) کے لیے جاؤ اور دعاء خیر کے لیے ان سے درخواست کرو اور جب حج سے واپس آجائیں تو ان سے ملو اور مصافحہ کرو قبل اس کے کہ وہ دنیا کے کاموں میں لگ کر گناہوں میں مبتلا ہوجائیں بلاشبہ ان کے ہاتھوں میں برکت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء میں فرمایا: "اللّٰھم اغفر للحجاج ولمن استغفرله الحجاج". (اے اللہ تو حاجیوں اور ان لوگوں کی مغفرت فرما جن کے لیے حاجی تجھ سے مغفرت کی درخواست کریں)۔

البتہ عورتوں کا نکل کر اسٹیشنوں یا ایئرپورٹ تک جانا مناسب نہیں، علماء نے اس کو منکرات میں شامل کیا ہے، اور شوہر کو تاکید کی ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو باہر نکلنے سے اس طرح کے مواقع سے بھی روکیں۔

[مجالس الابرار، ص: ۱۴۵]

سوال: ایک بیمار شخص نے اپنا حج فرض اپنے ایک دوست سے حج بدل کے طور پر کرایا، ان کو یہ اندازہ تھا کہ اب میرا جانا ممکن نہیں۔ اللہ کے فضل سے دو تین سال کے علاج کے بعد اب وہ تندرست ہوگئے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کا حج ہوگیا یا ذمہ میں باقی ہے؟

جواب: حج بدل کے شرائط میں یہ ہے کہ عذر تاحیات باقی ہو۔ اب جب کہ یہ تندرست ہوگئے ہیں تو خود حج کرنا لازم ہے، حج بدل ان کے لیے کافی نہیں رہا، البتہ اس کا ثواب ان کو یقیناً ملے گا۔

[ردالمحتار: ج۲/ص۲۳۸]

سوال: کیا عورت حج بدل میں جاسکتی ہے؟ ایک عورت اپنی ماں کی طرف سے حج بدل کرنا چاہتی ہے، کیا اس کی گنجائش ہے؟

جواب: شوہر یا کوئی محرم ساتھ میں ہو تو عورت بھی حج بدل میں جاسکتی ہے، لیکن مرد کو حج بدل میں بھیجنا زیادہ بہتر ہے۔ [ردالمحتار: ج۲/ص۲۴۱]

سوال: کیا حج بدل میں جانے والا اپنے گھر کا خرچ اور ان ایام میں اس کی تجارت یا تنخواہ میں جو نقصان ہوا ہے، اس کو حج بدل کرانے والے سے لے سکتا ہے؟

جواب: حج بدل کرانے والے سے گھر کا خرچ یا تجارت وتنخواہ کے نقصان کی تلافی کے لیے رقم لینا جائز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ حج بدل پر اجرت لینا اور دینا جائز نہیں ہے۔ [الدرالمختار: ج۱/ص۱۸۱]

سوال: کیا حج بدل میں ایسے شخص کو بھیجا جاسکتا ہے جس نے اپنا حج نہ کیا ہو تو کیا حج بدل ادا ہوجائے گا؟

جواب: حج بدل میں اس شخص کو بھی بھیجا جاسکتا ہے جس نے اپنا حج نہ کیا ہو، البتہ ایسے شخص کو بھیجنا افضل ہے جس نے اپنا حج فرض ادا کرلیا ہو، فتاویٰ ہندیہ میں صراحت موجود ہے: "لو أحج رجلاً لم يحج عن نفسه حجة الاسلام يجوز عندنا و سقط الحج عنه [فتاوی ہندیہ: ج۱/ص۲۵۷] (اگر کسی نے ایسے شخص سے حج بدل کرایا جس نے اپنا حج فرض ادا نہ کیا ہو تو احناف کے یہاں یہ جائز ہے اور حج کرانے والے کے ذمہ سے فرض ادا ہوجائے گا)۔

سوال: جس نے اپنا حج فرض ادا نہیں کیا ہے اور نہ وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے؛ لیکن حج بدل میں جانے کی وجہ سے کعبہ پر نظر پڑنے سے اس پر کیا حج فرض ہوجاتا ہے؟

جواب: بعض علماء کا فتویٰ تو یہی ہے کہ خانہ کعبہ پر نظر پڑنے کے بعد ایسے شخص پر حج فرض ہوجاتا ہے؛ لیکن راجح قول یہ ہے کہ جس کو حج کی استطاعت نہیں ہے خانہ کعبہ پر نظر پڑنے اور دوسرے کی طرف سے حج کرنے کی وجہ سے اس پر اس سال حج فرض نہیں ہوجاتا ہے، بلکہ آئندہ اگر اس کو استطاعت ہوئی تب حج فرض ہوگا۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں: "میرا خیال ہے کہ غیر مستطیع اگر مکہ داخل ہوجائے تو اس پر حج واجب نہیں ہوگا۔

[ردالمحتار: ج۲/ص۲۴۱]

سوال: احرام کی چادر جو حج اور عمرہ میں استعمال ہوتی ہے، اس کو عام استعمال میں لایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: حج اور عمرہ کے بعد اس کی چادر عام استعمال میں لائی جاسکتی ہے، اس کے ممنوع ہونے کی کوئی شرعی وجہ نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۱۰ مئی ۲۰۲۴ء

Date 10th May 2024

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) جعفر مسعود حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN000125 - STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں
NIZAMAT NADWATUL ULAMA
Nizamat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lukcnow - 226007 (U.P.)
معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91-8736833376
پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا